گوری سوئے سیج پر

صالحہ عابد حسین

نئی دہلی
ناولستان

گوری سوئے سیج پر...

صالحہ عابد حسین

ناولستان، جامعہ نگر۔ نئی دلی ۲۵

تقسیم کار

صدر دفتر :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دلی 110025

شاخیں :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار دلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ 202001

پہلی بار اپریل ۱۹۷۸ء قیمت =/۹

(جمال پرنٹنگ پریس۔ دہلی)

میرے بچو! تمہارے نام!

بزرگوں کی خدمت جن کا ایمان ہے

دل کی مسرت اور قلب کی طمانیت ہے۔

تم! جو دوسروں کو بھی روشنی

دکھا سکتے ہو۔

۲۰ ستمبر ۷۷ء

اعتراف و آرزو

اور کتابیں میں نے لکھی ہیں۔ اس کتاب نے خود کو مجھ سے لکھوایا ہے۔ میرے ذہن میں ناول کے مختلف پلاٹ تھے اور مسلسل کوشش تھی کہ جب بھی غمِ روزگار اور گرتی ہوئی صحت ذرا سی فرصت دے، تو ان میں سے کسی ایک کو شروع کروں۔ اس ناول کا پلاٹ شعوری طور پر میرے ذہن میں موجود نہ تھا، مگر تین مہینے پہلے جب بیماری کے شدید حملے کے درمیان اور اس کے بعد سوتے میں اس کو خواب میں دیکھتی رہی ——— لگاتار تین دن تک ——— اور جب نیند نہ آتی تو ساری رات اس کا پلاٹ، کردار، ڈائلاگ ذہن میں گونجتے، بنتے اور بگڑتے رہتے تو مجھے احساس ہوتا کہ اگر میں نے یہ ناول لکھنا شروع نہ کیا تو چین آ نہیں سکتا۔

اور پھر تین مہینے میں نے بیماری میں، پریشانی اور تیمارداری میں اسپتال میں داخل ہونے پر جب بھی ذرا سی فرصت ملی، اس کو لکھا ——— اس احساس کے ساتھ لکھا کہ شاید یہ میرا آخری ناول ہے شاید وقت اتنا کم ہے کہ دیر ہو گئی تو پورا نہ ہو سکے۔ میری نرسیں اور ڈاکٹر، میرے ملنے والے، میرے بچے اور شوہر سب حیرت زدہ تھے کہ آخر اس کو کیا ہوا ہے؟ اس انہماک سے تو کبھی اور کوئی ناول نہیں لکھا ——— وہ تو برسوں پڑا رہا کرتا تھا ——— اسی لیے مجھے احساس ہے کہ اس ناول نے خود کو مجھ سے زبردستی لکھوایا ہے۔ کیوں؟ یہ میں نہیں

جانتی! ہاں یہ جانتی ہوں کہ یہ آج ہمارے ملک کا اہم مسئلہ ہے شاید برسوں سے دماغ کے کسی گوشے میں یہ مواد پک رہا تھا جو اچانک پھوٹ بہا ــــــ اسی لیے تو اس مختصر مدت میں نہ صرف میں نے اسے لکھا، بلکہ نظرِثانی بھی کی اور پورا کا پورا خود نقل بھی کیا۔

نہیں جانتی اس ناول کو میں چھپا ہوا دیکھ پاؤں گی یا نہیں ــــــ یہ بھی نہیں جانتی کہ اس کو میرے دوسرے ناولوں سے بہتر سمجھا جائے گا یا کم تر ــــــ ہاں اگر چند نوجوانوں کو بھی اس مسئلے کی اہمیت اور ٹریجڈی کا احساس ہو جائے جو آج کی نسل کے اکثر لوگوں میں دولت پرستی، جاہ پسندی، بزرگوں کے مسائل کو نہ سمجھنے اور روپے ہی کو سب سے بڑی قدر مان لینے کی وجہ سے کتنے گھروں میں دیکھی جا سکتی ہے، تو میں اپنے کو خوش نصیب اور اس ناول کو کامیاب سمجھوں گی۔ اس کے کردار ڈھونڈنے سے ہر خاندان میں پائے جا سکتے ہیں!

۲۰؍ستمبر ۷۷ء   صالحہ عابد حسین

(۱)

وہی ہلکا شربتی ریشمی غرارہ، چکن کا سفید کرتا اور ہلکا شربتی چنا ہوا دوپٹہ تھا۔ دوپٹہ کا ایک سرا ان کی پتلی جھریوں پڑی گردن کو چھوتا ہوا، بوڑھے سینے پر سے پہلو میں گر پڑا تھا۔ چھوٹی سی پتلی ناک میں، جس پر عمر کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا، اصلی ہیرے کی کیل جگمگا رہی تھی۔ پہلے پہل انھوں نے اس کے لیے "سستے پتھر کی کیل خریدی تھی" خدا کے لیے اب یہ چھینکا اتار ڈالو ــــ یہ لونگ پہن لو ــــ بہت اچھی لگو گی!" ماں جی کے ڈر کے باوجود اس نے فوراً نتھ اتار کر کیل پہن لی تو چہرہ جگمگا اٹھا تھا ــــ کلائیوں میں چند کانچ کی رنگین چوڑیاں اب بھی پڑی ہیں۔ کبھی کوئی لڑکی بالڑکا کہہ اٹھتا "اماں کو اب تک چوڑیوں کا شوق ہے" تو وہ بھڑک اٹھتی۔ "کیوں نہ ہو۔ خدا رکھے میرے سہاگ کو .... سہاگن کی چوڑیاں تختے پر ٹوٹتی ہیں!" وہ ہمیشہ کامدار اور سادی چوڑیاں ملا کر بھرے بھرے ہاتھ پہنتی تھی۔ "توبہ یہ کنواریوں اور سہاگنوں کے ڈنڈے سے ہاتھ کتنے بدنما لگتے ہیں!" اور اپنی بہو بیٹیوں کو باتیں سنانے لگتی ــــ تو اب یہ چوڑیاں۔ یہ چوڑیاں۔ سیدھے ہاتھ کی کن انگلی میں بڑے سے فیروزے کی انگوٹھی اب بھی موجود ہے مگر گلے میں اس کی دی ہوئی زنجیر نہیں ــــ کتنے برسوں سے یہ گردن اس زنجیر سے خالی ہے ــــ کبھی وہ اس پر دکھ کا اظہار کرتا تو وہ مسکرا کر کہتی۔ "تمھارے پیار کی زنجیریں تو اب بھی جکڑی ہوں...."

تھوڑے کھلے ہوئے لبوں کے درمیان چند سیاہی مائل موتی اب بھی جھانک رہے ہیں۔ انھیں مسی سے نفرت تھی۔ اچھے بھلے دانتوں کو کالا کر کے ان کی خوبصورتی خاک میں

ملانا، یہ عورتوں کا عجیب نخرہ ہے۔ مگر ماں جی کو ہر پرانی چیز آیتِ حدیث تھی۔ بھلا ان کی بہو اور امی کے دانتوں میں مسّی نہ لگے۔۔۔ اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اس کے موتیوں کی سی لڑی جیسے دانتوں میں مسّی کی ہلکی ہلکی کالی لکیروں کے حلقوں نے اور چمکا دیا تھا...... آنکھیں جو خوشی میں ہیرے کی کنیوں کی طرح دمک اٹھتی تھیں، غصے میں چنگاریاں برساتی تھیں اور پیار میں مسکراہٹ کے پھول ...... وہ بند ہیں۔ کیوں بند ہیں؟ ان میں سے وہ روشنی ۔۔۔ غصے کی، پیار کی، خوشی کی کیوں نہیں چھن رہی ہے؟ اور بال ۔۔۔ وہ گھنیرے سیاہ سیدھے بال جو اس کے گھٹنوں کو چھوتے تھے کبھی ۔۔۔ اب کتنے کم رہ گئے ہیں! مگر ان سفید بالوں کے ہالے نے اس کے چہرے کو کچھ اور منور نہیں کر دیا کیا......؟

انھیں یہ ہوش نہیں تھا کہ اس کے اوپر سفید چادر ڈال دیں۔ یا کلام پاک پڑھیں ۔۔۔ جب رحیمن نے کھلا ہوا مصحف ان کے ہاتھوں پر رکھ کر کہا "میاں یہ دعا کا وقت ہے ۔۔۔ یہ اللہ کا کلام پڑھنے کا ۔۔۔ اسے یاد کرنے کا وقت ہے ...." تو ان کے کانپتے ہاتھوں پر کلام پاک آپ ہی آپ بلند ہو گیا تھا۔ ہونٹ ہل رہے تھے ۔۔۔ مگر وہ کیا پڑھ رہے ہیں، کیا کہہ رہے ہیں...... یہ سب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ۔۔۔ نظریں تو اس چہرے پر جمی تھیں جس کو پچاس سال دیکھتے دیکھتے بھی جی نہ بھرا تھا۔

رحیمن ان کے ہاتھ پاؤں سیدھے کر چکی تھی۔ آنکھوں سے مسلسل ٹلکچے آنسو بہہ رہے تھے۔ بوڑھا مالی نظیرا چپ چاپ دور کھڑا ہچکیاں لے رہا تھا۔ اور چوکیدار کالی چرن جو ان ہی کے ہاں ایک کوٹھی میں رہتا تھا ۔۔۔ دروازے میں کھڑا تھا ۔۔۔ سر جھکائے! پریشان! "آج میاں اکیلے ہو گئے۔ ہنسوں کا جوڑا بچھڑ گیا!" تینوں کے دل میں ایک ہی خیال آ رہا تھا!

رات دھیرے دھیرے ہرے بھرے کھیتوں سے گھرے اس ننھے

سے باغیچے کے احاطے میں چپکے سے آ گئی تھی جس کے بیچوں بیچ پرانی وضع کا ان کا خاندانی گھر اپنی ویرانی پر سکتے کے عالم میں کھڑا تھا ـــــ ہوا ستونوں سے سر ٹکرا کر رو رہی تھی اور سارے گھر میں روشنی ہونے کے باوجود اندھیرا محسوس ہو رہا تھا۔ گھور اندھیرا ـــ ان کی زندگی کی شام رات میں ڈھل چکی تھی ـــ ان کی شمع حیات سامنے بجھی پڑی تھی۔ اب آنکھوں کے یہ چراغ کبھی نہ جھلملائیں گے! کبھی ان جلتی شمعوں سے فراق کے آنسوؤں کی مالائیں ٹوٹتی وہ نہ دیکھیں گے ـــ ان خمیدہ مرجھائے لبوں پر وہ پیار میں ڈوبی مسکراہٹ نہ ابھرے گی جو ان کو دیکھ کر بے اختیار نکھر اٹھتی تھی ـــ غصے میں ان کا تناؤ اب انہیں نہیں جھنجھلائے گا ـــ ہیرے کی یہ کیل جگمگا رہی ہے مگر یہ حساس نتھنے اب کبھی نہ پھڑکیں گے ـــ یہ باہیں ـــ وہ گدازباہیں جو اب سوکھی جھریوں بھری خشک ٹہنیوں میں بدل چکی ہیں۔ اب ان کی گردن میں کبھی حائل نہ ہوں گی ـــ یہ پتلے سبک ہاتھ جو اب بھی نرم ہیں ـــ ان کا دباؤ اب وہ کبھی محسوس نہ کر یں گے!! ان ہونٹوں سے وہ مدھر، شیریں، سبک، پریم رس میں ڈوبا لفظ "سیاں" اب کب سنا جا سکے گا؟ کب ـــ کب کب؟؟

کالی چیرن، اختر علی کے ہاں اور پٹروس کے دو ایک گھروں میں خبر دے کر ابھی لوٹا تھا ـــ چند بوڑھے لوگ، دو چار نوجوان، پانچ چار عورتیں آ کر کمرے میں بھر گئی تھیں ..... وہ کچھ کہہ رہی ہیں ..... یہ خوشبوئیں کیسی پھیل رہی ہیں فضا میں؟ ان کے سرہانے موم بتیاں کیوں آنسو بہا رہی ہیں ـــ پلنگ کو کیوں ٹیڑھا کر دیا گیا .... ان کے اوپر یہ شال کس نے لا کر ڈال دی جو وہ پچیس برس پہلے کشمیر سے لائے تھے ـــ جو اب انہیں کی طرح سال خوردہ ہو چکی تھیں، رنگ روغن کھو چکی تھی مگر اس کے پھول اب بھی چمک رہے تھے وہ اسی طرح نظریں بیوی پر جمائے بیٹھے تھے۔ کلام پاک پڑھنے کی آوازیں کان میں آ رہی تھیں مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

"سہیل بھیا ـــ" کسی نے ان کا شانہ چھوا
انھوں نے سر اٹھایا ـــ اپنے دوست اختر علی پر ایک نظر ڈالی اور سر جھکا لیا۔ "ذرا باہر چلو ـــ" انھوں نے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا، نازش نے ان کی گود سے کلام پاک لے کر حمین کو پکڑا دیا ـــ اور دونوں باپ بیٹے ان کو سہارا دے کر بیٹھک میں لے آئے!

تھوڑی دیر خاموشی کا ڈیرا رہا ـــ آخر اختر علی نے جمع ہونے والے لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ اب جا کر آرام کریں...... کل وقت کی اطلاع کر دی جائے گی! لوگ ایک ایک کر کے سہیل میاں کے پاس آتے۔ کچھ کہتے، آنسو پونچھتے اور آہستہ آہستہ کمرے سے نکل جاتے۔

نازش نے آ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا "چچا جان ـــ کچھ کام بتائیے! اپنے ـــ فون نمبر ـــ میں تار دوں۔ شہر جا کر فون کروں ـــ چچی جان کے بچوں کو، عزیزوں کو، ان کے وطن والوں کو خبر ملنی چاہیے......"

وہ نازش کا منھ دیکھتے رہے۔ نازش جسے وہ بہت چاہتے تھے ـــ اس کی ہر بات مانتے تھے ـــ اختر علی سے کہا کرتے تھے یار تو کتنا خوش قسمت ہے کہ ناز و جیسا بیٹا قدرت نے بخشا ہے ـــ ایک دن میں اسے تجھ سے چھین لوں گا۔ اور اختر علی ہنس کر کہتے ـــ "ارے تمہارا ہی تو ہے۔" مگر اس وقت لگتا تھا کوئی بات وہ سمجھ نہیں پا رہے ہیں ـــ تار ـــ؟ فون ـــ بچے ـــ عزیز ـــ"

"ہاں سہیل بھیا ان سب کو خبر دینی چاہیے ـــ" آہستہ سے اختر علی نے کہا ـــ مگر ایسے جیسے کوئی نازیبا بات کہہ رہے ہوں۔ "کیوں۔ آخر کیوں؟"
نازش کچھ کچھ ان کی حالت سمجھتا تھا۔ اس نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی نم آنکھوں سے لگا لیے۔

"چچا جان ـــ آپ کا دل بہت بڑا ہے۔ آپ بڑے صابر ہیں!

"چچا جان اطلاع تو بھیج دیجیے ـــــ ورنہ الٹا آپ پر الزام رکھ دیا جائے گا"
وہ کرسی کے سرے پر بیٹھے تھے، یکا یک پیچھے گر سے گئے اور تکیے پر سر ٹیک دیا ـــــ اندر سے کسی کے کلام پاک پڑھنے کی آواز آرہی ہے ـــــ
یہ وہ نہیں ـــــ وہ نہیں ـــــ وہ تو بڑی خوش الحانی سے قرات کے ساتھ تلاوت کیا کرتی تھی ـــــ روز صبح سویرے ان کی آنکھ اس کی خوش الحان اور عقیدت سے پر تلاوت کی آواز سے کھلتی تھی۔ بچے فقرے کستے تھے۔ غزالی تو مذاق بھی اڑاتا، مگر وہ ایک "ڈرموئے ـــــ جہنم میں جائے گا" کہہ کر ہر بات کو ٹال جاتیں ـــــ ہندستان میں، باہر کے ملکوں میں جا کر بھی کبھی ان کی نماز اور تلاوت ناغہ نہیں ہوئی۔
"سہیل ـــــ پتے اور فون نمبر ہیں تمہارے پاس؟" اختر علی نے ان پر جھکتے ہوئے کہا!
وہ چونکے ـــــ ہاں ـــــ ان کی نوٹ بک میں ہوں گے ـــــ"
اُف یہ ویران آنکھیں ـــــ یہ کھوکھلی آواز۔ انھوں نے نازش کو دیکھا۔
نازش اٹھ کر اندر چلا گیا اور چند منٹ بعد ایک بڑی سی نوٹ بک لیے آتا نظر آیا ـــــ "مہرو کی کاپی" ان کے دل سے آواز آئی۔ وہ اور بچے کس قدر مذاق اڑاتے تھے۔ "نوٹ بک ہے اماں یا عمر عیار کی زنبیل۔" جو بھی اسے لکھنا ہوتا ایک ہی کاپی میں لکھ لیتی تھی۔ آمدنی اور خرچ کا حساب، دھوبی کے کپڑے ـــــ بچوں کے پتے اور فون نمبر ـــــ یاد رکھنے والی باتیں جن کو وہ اب بہت بھولنے لگی تھی ـــــ اور کبھی کبھی اپنے دل کی کوئی بات بھی لکھ دیتی تھی ـــــ خط لکھنا ہوتا تو اسی کاپی میں سے کاغذ پھاڑ کر لکھ دیتی۔ کتنی بار اس کے بچوں نے پیڈ لا کر دیے تھے۔ "خط اس پر لکھا کرو ـــــ" مگر اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ "ہنھ! کاغذ کاغذ سب برابر ہیں ـــــ برابر مقدس ـــــ اِس پر لکھا تو کیا اور اُس پر لکھا تو کیا!"

نازش تیزی سے ورق الٹ پلٹ رہا تھا ــــ "چچا ــــ یہاں تو ــــ مل نہیں رہا ــــ"

"آخر میں دیکھو ــــ"

بڑی کوشش کے بعد مختلف صفحوں پر پتے، کہیں کوئی فون نمبر لکھا نظر آیا۔

"یہ تو تنویر بھائی کا امریکہ کا پتا اور نمبر ہے!" "مگر اب تو وہ آگیا ہے، حیدر آباد میں ہے" اختر علی نے کہا۔ نازش پھر ڈھونڈ رہا تھا ــــ "جی ــــ یہ ہے حیدر آباد کا پتا اور ــــ ہاں ــــ یہ فون نمبر بھی لکھا ہے ــــ"

"اور غزالی کا؟" اختر علی نے سوال کیا۔

"غزالی کا تو وہی نمبر اور پتا ہے ــــ اس نے تو اپنا گھر خرید لیا ہے نالندن میں۔" نازش نے آہستہ سے باپ کو جواب دیا "اور یہ ــــ یہ دیکھیے شاہین کے کراچی کے گھر کا پتا اور نمبر ــــ" "شاہین؟ وہ تو ــــ وہ تو امریکہ میں تھی؟" اختر علی نے کہا۔

"اب پاکستان واپس آگئی ہے" اتنی دیر میں پہلی بار انھوں نے زبان کھولی۔

"جی ہاں ــــ چچی جان نے بتایا تھا ــــ" اور اس کی آواز بھرا گئی ــــ

"تم کیوں یہ سب کر رہے ہو بیٹا ــــ کوئی فائدہ نہیں کوئی جلدی نہیں ــــ اب کیا رکھا ہے ــــ خبر مل جائے گی کبھی نہ کبھی ــــ"

"چچا جان وہ لوگ شاید آنا چاہیں"

"کوئی نہیں آئے گا ــــ انھیں فرصت کہاں ہے؟"

"نہیں سہیل، آخر ان کی ماں ہیں ــــ"

"ماں ــــ ماں ہیں ــــ ہاں ماں تو ہیں ــــ بدنصیب ماں ــــ مگر اب کہاں ہیں؟" انھوں نے خشک لہجے میں کہا "پلیز چچا جان۔ اجازت دیدیجیے ــــ"

"تم میرے بیٹے ہو ـــــ جو چاہے کرو ـــــ تمھیں اجازت ہے" نازش نے پھر ان کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر آنکھوں سے لگا لیا اور مڑ کر باپ سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگا۔ ان کے کان میں کچھ لفظ پڑتے رہے۔ موٹر ـــــ خورشید باجی ـــــ پرچہ ـــــ عالیہ ـــــ فون ـــــ تار ـــــ انتظار ـــــ برف کی سلیں۔

پھر وہ مڑا ـــــ "چچا جان جلدی نہ کیجیے گا ـــــ میں شہر جا رہا ہوں جتنی جلدی فارغ ہوا ـــــ واپس آؤں گا ـــــ سامان بھی وہیں سے لیتا آؤں گا ـــــ" آخری جملہ اس نے مڑ کر باپ سے کہا۔

"جلدی ـــــ ؟ نہیں نہیں ـــــ مجھے کوئی جلدی نہیں بیٹا ـــــ پچاس برس کا ساتھ ہے ـــــ اب پچاس گھنٹے اسے اور دیکھوں گا۔ پورے پچاس گھنٹے بس ـــــ اور پھر جس کی امانت ہے ـــــ اسے سونپ دوں گا ـــــ"

ان کی آواز ان کا چہرہ ان کی حالت ـــــ نازش کانپ گیا!

"ابّا ـــــ میں جا رہا ہوں ـــــ آپ چچا جان کے پاس ـــــ"

"تم بے فکر رہو ـــــ اور جلدی کرو ـــــ" اس نے باہر آ کر کالی جرن کو بلایا "تم اور نظیرا بابا چچا کے پاس ہی رہنا ۔۔۔۔۔"

اس نے سر ہلایا اور سسکیاں لینے لگا۔

پھر وہ اپنے باپ کے پاس آیا "ابا جان میں جا رہا ہوں ـــــ جتنے لوگوں کو اطلاع دے سکتا ہوں دیدوں گا ـــــ آپ ـــــ آپ تھک گئے ہوں گے ـــــ ذرا دیر گھر جا کر ۔۔۔۔۔"

"نہیں بیٹا ـــــ میں یہیں رہوں گا ـــــ وہ گھر سے نکالے گا تب بھی رہوں گا۔ اس وقت اس کو چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں" "مگر ابا جان" اس نے آواز آہستہ کر کے کہا "چچا جان کی یہ کیا حالت ہو رہی ہے ۔۔۔۔

چچی جان آخر بیمار تھیں۔ کمزور تھیں ـــــ ان کو تو جانا ہی تھا......"

اختر علی نے عجیب نظروں سے بیٹے کو دیکھا اور سینے سے ایک آہ نکل گئی

"تم نوجوان لوگ ـــــ تم نہیں سمجھ سکتے بیٹا ـــــ ایسی عورت ـــــ ایسی بیوی ـــــ اس سے تو سو برس بعد بھی بچھڑتا ـــــ اور پھر بڑھاپے میں ـــــ اور آج کل کے زمانے میں تو اور بھی ـــــ میاں بیوی ہی ایک دوسرے کے ساتھی اور رفیق رہ جاتے ہیں۔" وہ یہ کہتے کہتے رو پڑے۔

"ابا جان خدا کے لیے اپنے آپ کو سنبھالیے...... چچا جان کو آپ کے سوا اور کون سنبھالے گا ـــــ مجھے ان کے ساتھ اب آپ کی بھی فکر ہوگئی!"

"تم جاؤ۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا ـــــ بھابی کے سب بچوں کو فون 'تار' جو بھی کر سکو کر دینا ـــــ خورشید کے پاس خود چلے جانا ـــــ اور برف کی سلیاں جلدی بھجوا دینا ـــــ کہیں کہیں ......" انھوں نے جملہ پورا نہیں کیا مگر نازش مطلب سمجھ گیا ـــــ "بہت اچھا ابا جان" اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

سہیل میاں دور بیٹھے بس سُن رہے تھے۔ خدا جانے آج ان کے بہرے کان اتنے تیز کیسے ہوگئے تھے!

"میں اندر جاؤں گا اختر" اور یہ کہتے کہتے وہ باہر برآمدے میں نکل آئے۔ کالی چرن ان کے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا تھا ـــــ نظیر امالی بہت سے پھول لیے کھڑا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ـــــ بہت ہی آہستہ چلتے ہوئے سامنے کے دروازے میں گئے ـــــ یہ ان کا سامان اور کاغذوں اور دوسری چیزوں کے رکھنے کا کمرہ تھا ـــــ ذرا وہاں رکے اور پھر اپنے اور بیوی کے اس مشترک کمرے میں داخل ہوگئے جو ایک ہفتے سے مشترک نہ رہا تھا!

قبلہ رو پلنگ پر وہ اپنی پسندیدہ شال اوڑھے سو رہی تھیں ـــــ چہرہ کھلا ہوا تھا ـــــ جبیں پر موم بتی کی زرد روشنی جھلملا رہی تھی ـــــ آنکھوں کے گرد کی باریک باریک چنٹ جو کنپٹیوں پر جا کر غائب ہو جاتی تھی نہ کچھ نمایاں اور

ہو گئی تھی، اور لبوں کے گرد کی دونوں قوسیں اور گہری نظر آ رہی تھیں! کسی نے ان کے پلنگ کے برابر ان کی آرام کرسی لا کر ڈال دی تھی، وہ اس پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئے۔ نیلرا نے جلدی سے گرم دُسّہ ان کو اڑھا دیا۔ رحیمن پیچھے کھسک کر بیٹھ گئی اور آواز ذرا دھیمی کر لی۔ اسے صرف سورۂ یٰسین زبانی یاد تھی اور وہی مسلسل پڑھے جا رہی تھی۔ سلیمہ بھابی نے کلام پاک کو گردانا اور پھر رحیمن سے کچھ کھسر پھسر کی۔ ان کے کان میں آواز پڑی "درد بڑھ گیا ہے..... صبح....." اور وہ مڑ مڑ کر سہیل میاں کو دیکھتی لنگڑاتی کمرے سے باہر چلی گئیں..... مالی نے سارے پھول لا کر اُن کی پائنتی رکھ دیے۔ کتنے چاؤ سے یہ پھول اس نے لگوائے تھے ــــ یہ باغیچہ اسی کا شوق تو تھا ــــ اسی حال میں بھی صبح شام کچھ دیر مالی کے ساتھ باغ میں گھوم پھر کر پھولوں، پودوں اور پھلوں کے پیڑوں کو دیکھا کرتی۔ کالی چرن نے ایک ٹاٹ کا ٹکڑا لا کر دروازے پر ڈال لیا تھا اور کمبل لپیٹ کر کواڑ سے ٹیک لگا لی اور کبھی کبھی دونوں ہاتھ پرنام کے انداز سے جوڑ کر منہ منہ میں سنسکرت کے کچھ اشلوک پڑھ لیتا تھا۔

ان کی کمر دکھ گئی تھی ــــ کرسی سے ٹیک لگا کر وہ ایک ٹک بیوی کو دیکھے جا رہے تھے!

اور رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔

(۲)

"ارے ذرا ہوش میں رہ ——— ہر وقت بیوی کا کلمہ پڑھے ہے" نیچے مہرو کی آواز گونج رہی تھی۔

"اماں آپ بات سمجھتی تو ہیں نہیں خواہ مخواہ بگڑنے لگتی ہیں" تنویر کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

"ہاں ہاں میں تو بے سمجھ، بے عقل ہوں ——— تیری پسند کی عورت گھر میں لے آئی ——— اس سے بڑھ کر حماقت کیا ہو گی ———"

کیا ہو جاتا ہے ان کو غصے میں؟ انھوں نے جلدی جلدی تولیہ سے جسم خشک کیا اور کپڑے بدلنے لگے۔ کہیں ماں بیٹے میں ٹھن نہ جائے

"اماں پلیز بات تو سنیئے میری۔ نازنیں کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ دعوت تو میں نے کی ہے۔ میرے دوست آرہے ہیں۔" "تو میں دعوت کا انتظام کرنا نہیں جانتی۔ تیری جورو بڑی سگھڑ ہے ——— تو مجھ سے نہیں کہہ سکتا۔"

"امی سے کہہ دیا تو کیا ہوا ——— وہ سامنے تھی ——— وہ نئے زمانے

کے لوگ ہیں ــــ ٹی پارٹی کا انتظام آپ کیسے کرتیں!" "ہوں ــــ تو اس گھر میں اب میرا نہیں اس کا راج ہو گا؟"

" اس غریب کا راج آپ کے گھر پر کیوں ہونے لگا...... آپ کا گھر ہے آپ کا حکم چلتا ہے۔ وہ تو صرف کام کرنے والی ہے" " تو میں نے لونڈی بنا کر رکھا ہے تیری مہارانی کو ــــ" "اماں خدا جانے آپ کیا چاہتی ہیں۔ خوامخواہ جھگڑا بڑھا رہی ہیں۔"

وہ الجھ رہے تھے۔ کیوں خوامخواہ بیٹے سے لڑ رہی ہیں یہ! " ارے میں برا کہتی ہوں۔ شرم نہیں آتی یہ کہتے ہوئے۔ وہ مجھ سے سیدھے منھ بات نہیں کرتی۔ بڑے گھر کی ہے۔ ہم غریبوں کو کیوں پوچھے گی۔ کسی بات کی اجازت نہیں لیتی۔ جہاں چاہے چلی جاتی ہے...... بچی کو میرے پاس نہیں آنے دیتی...."

" خوامخواہ ــــ اور ہر بات، ہر کام کی زندگی بھر کون اجازت لیتا پھرتا ہے اماں ــــ بھلا میں ہر کام آپ سے پوچھ کر کرتا ہوں کیا؟"

" تیری اس کی کیا برابری ہے۔"

" کیوں نہیں برابری ــــ وہ اس سے بڑھ کر ہے۔ اس گھر کی بہو ہے۔ ہزار برس کی نیو ہے ــــ روشنی ہے ہمارے اندھیرے گھر میں اس کے دم سے" انھوں نے اندر آتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

" اچھا اب تم آئے ہو بہو بیگم کی حمایت کرنے؟"

" ہاں ہاں حمایت کرنے آیا ہوں۔ اتنی دیر سے خوامخواہ بک بک کر رہی ہو۔ آخر تمھیں کب عقل آئے گی!"

" ہوں! بڑے عقل مند۔ ایک تم ہو عقل والے ایک تمھاری بہو ہے اور میں تو احمق ہوں؟"

" اری نیک بخت تجھے کون احمق سمجھ سکتا ہے۔ تیس برس سے مجھی کو احمق بنا رکھا ہے ــــ وہ نہیں، جورو کا غلام تو آپ کا یہ خادم ہے بیگم۔"

انھوں نے صلح کی جھنڈی دکھائی اور مسکرا کر بیوی کو دیکھا۔ انھیں غصہ تو آنا ہی کہاں تھا۔ ضرورتاً کبھی غصے کا اظہار کرتے تھے۔ وہ بھی خوب جانتی تھی یہ بات۔ اسی طرح وہ ماں اور بیوی کے جھگڑے چکاتے تھے۔ اس وقت ماں کی طرف داری کرتے تھے آج بہو کی کر رہے ہیں۔ مگر یہ چاپلوسی اور چونچلے بیوی کے کرتے اور وہ ان کی یہ چال نہ سمجھ پاتی تھی۔

"اچھا اچھا ــــ اب بیٹے کے سامنے بوڑھے چونچلے نہ بگھارو سیاں"۔

"میں چونچلے بگھار رہا ہوں یا تم بوڑھا چونڈا ہلا ہلا کر سیاں سیاں کر رہی ہو ــــ بے شرم ــــ" اور دونوں ہی ہنس پڑے۔ انھوں نے دیکھا تنویر کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ شاید سوچ رہا ہو، اماں اور ابا میاں اب تک رومان لڑاتے ہیں اور چاہتے ہیں میں بیوی سے بات نہ کروں۔

انھوں نے بڑھ کر بیٹے کی پیٹھ تھپ تھپائی۔ "جاؤ تم اپنا کام دیکھو ــــ ان کو میں سنبھال لوں گا ــــ رات سے ان کی طبیعت خراب ہے اسی لیے اور چڑچڑی ہو رہی ہیں ــــ"

"کیا مسکوٹ ہو رہی ہے میرے لعل سے؟"

اب لہجے میں غصہ نہیں پیار تھا۔

"کیوں میرا بیٹا نہیں ہے۔ صرف تمہارا لعل ہے؟"

"اے ہے بڑے بیٹے والے۔ نو مہینے پیٹ میں تمھیں نے تو رکھا تھا۔ دو برس خون پلا کر تمھیں نے تو پالا تھا"

"تمہارا بس چلتا تو یہ بھی کرا لیتیں۔ قدرت کے قانون سے مجبور تھیں" ان کا اونچا قہقہہ سارے گھر میں گونج اٹھا۔

دور سے بہو کے قدموں کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ تنویر نے بھی یہ آواز سن لی۔ چاروں طرف نظر ڈالی اور چپکے سے کھسک گیا۔ کتنا چاہتا ہے وہ اپنی بیوی کو۔

انھوں نے مڑ کر بیوی کو دیکھا ــــ ضرور اب برسیں گی بھر بھر۔ مگر وہ
اب بڑے انہماک سے پوتی کے فراک پر پھول بنا رہی تھی
کیا ہے یہ عورت بھی !!!

وہ چونک پڑے ــــ یہ سب ــــ یہ سب خواب تھا ــــ وہ
سو رہے تھے؟ نہیں ــــ وہ سوئے نہیں جاگ رہے تھے ــــ تو ــــ
تو..... ؟ ان کی نظریں بیوی کے پلنگ کی طرف اٹھ گئیں ــــ تیز بتی بجھا دی
گئی تھی۔ سرہانے دو موم بتیاں روشن تھیں۔ کمرہ میں لوبان کی خوشبو اور
دھواں پھیلا ہوا تھا ــــ برامدے میں جلتے بلب کی روشنی کی ایک لکیر سیدھی
اس چہرے پر پڑ رہی تھی جس کو پچاس برس دیکھتے دیکھتے وہ اتنے عادی
ہو گئے تھے کہ چار گھنٹے نہ دیکھ پائیں تو بے چین ہو جاتے تھے.....
انھوں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ رحیمن اپنی جگہ لڑھک کر سو گئی تھی۔
کالی چرن کواڑ سے ٹیک لگائے خراٹے لے رہا تھا ــــ نظیرا، سر جھکائے
گٹھری سا بنا کونے میں بیٹھا تھا۔

ان کی وفاداری پر ان کے دل میں ہوک سی اٹھی ــــ اس دنیا میں
کون اپنا ہے، کون پرایا؟ کیسا خون؟ کیسی ممتا؟ کیا اولاد ــــ کیا بھائی
بہن ــــ بس دھوکا ہے ــــ فریب ہے ــــ مایاجال ہے ــــ یہ غیر ہیں
یہ پرائے ہیں ــــ کالی چرن اور رحیمن بوڑھے کمزور غریب ــــ زندگی بھر
جنھوں نے خدمت کی ــــ مصیبت اٹھائی۔ جن کو سینکڑوں مرتبہ ڈانٹا پھٹکارا
ہوگا ــــ مہرو نے ــــ میں نے، بچوں نے ــــ جن کے دکھ سکھ کے بارے
میں شاید ہی کبھی سوچا ہو ــــ کم سے کم میں نے تو نہیں سوچا ــــ ہاں
اس کا ہاتھ کھلا تھا ــــ دل کھلا ہوا تھا ــــ وہ مدد بھی کرتی تھی ــــ خیال
بھی کرتی تھی ــــ مگر کس کا نہیں کرتی تھی ــــ ان بے چاروں کے لیے

تو اپنے عزیزوں اور دوستوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں کیا ہوگا ـــــ مگر
یہ دونوں اس کی بیماری کا سن کر، بلاوے پر دوڑے چلے آئے ـــــ رحیمن،
بوڑھی، کمزور رحیمن اتنے دن سے اس کا کام کس لگن، کس محنت سے کر رہی
ہے ـــــ نظرا اور کالی چرن میرا کتنا خیال کرتے ہیں ـــ گھر کی دیکھ بھال
باغ کا کام اور پھر ڈاکٹر کے پاس دوڑنا ـــــ دوا لانا ـــــ یہ نہ ہوتے ـــــ
یہ نہ ہوتے تو ـــــ اور جب نہیں تھے ـــــ مہینے بھر میں کیا حال ہو گیا تھا خود
ان کا اور مربضہ کا ـــــ یہ غیر دکھ بٹاتے رہے۔ خدمت کرتے رہے ـــــ
دلداری، خیال ـــــ اور اپنا خون ـــــ اپنے کلیجے کے ٹکڑے ـــــ "کہاں ہیں
نرہ ـــــ کہاں ہیں مہرو تمھارے لاڈلے بیٹے اور بیٹیاں ـــــ" بے قراری سے
یہ جملہ ان کے منھ سے نکلا اور وہ مہرو پر جھک گئے ـــــ

مگر ـــــ مہرو تو ـــــ بڑی شانت ـــــ بڑی پُر سکون لگ رہی ہے!
کتنا بے نیاز، کتنا مطمئن، ہر احساس سے عاری ہے اس وقت یہ چہرہ ـــــ
یہ چہرہ ـــــ جس کا رنگ دم دم بدلتا تھا ـــــ خوشی، خفگی، پیار، نفرت، غصہ،
بیزاری، عقیدت، جوش، دلچسپی ـــــ ہر جذبے کے ساتھ اس کے چہرے کا
اکسپریشن بدلتا تھا ـــــ رنگ بدلتا تھا ـــــ کتنے چہرے چھپے تھے اس ایک
چہرے کے پیچھے ـــــ محبت کی دیوی کا چہرہ ـــــ ممتا کی مورت کا چہرہ
درد مند عورت کا چہرہ، رشک و رقابت، نفرت اور غصے کی کالی مائی کا چہرہ!
خدمت اور ایثار، صبر و برداشت، عفو و درگذر کرنے والی ہندوستانی ناری
کا چہرہ!

مگر ان چہروں، ان جذبوں، ان احساسات کی قدر کس نے کی؟ ماں جی
نے؟ میں نے؟ سسرال والوں نے؟ میکے کے عزیزوں نے؟ اپنی اولاد نے؟
دوستوں اور سہیلیوں نے؟ کس نے نہیں۔ کسی نے نہیں پہچانا اِسے ـــــ
سب نے عیبوں کی کھوج کی ـــــ برائیوں کو پکڑا ـــــ مزاج کو برا کہا ـــــ

مگر اس کے دل کے اندر کسی نے جھانک کر نہ دیکھا ــــ بے وفائی اور بے مجبنی کے ان داغوں پر کسی نے نظر نہ ڈالی جو اس کے دل میں جلتے رہتے تھے۔

مگر ــ مگر ــــ وہ تو اسے چاہتے رہے ــــ محبت کرتے رہے۔
دلداری، دل جوئی ــــ اعتماد دیا۔ بھروسہ دیا ــــ اپنا ہر پیسہ اسے دے دیا ــــ اپنی جان کا بھی مختار اسے بنا دیا! انھوں نے بنایا......
انھوں نے دیا ــــ یا وہ خود ــــ خود اس کی صلاحیتوں نے اپنے یہ سب حق ان سے چھین لیے ــــ اپنا سب کچھ نچھاور کر کے وہ ان کے دل پر قابض ہو گئی۔ قابض ہو گئی زبردستی ــــ تو پھر اب ــــ اب مہرو ــــ مہرو تم مجھے کیوں چھوڑ گئیں ــــ کس پر ــــ کس پر ــــ
باہر نیم اور املتاس کے پیڑوں میں ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی ــــ ان کی قسمت پر فریاد کر رہی ہے ــــ بوندوں کی ٹپ ٹپ چھت پر سنائی دے رہی تھی ــــ زمین و آسمان رو رہے ہیں ــــ اس کے مرنے پر ان کی زندگی پر؟

سر نے ایک جھٹکا کھایا ــــ "کیا نیند آ رہی ہے؟" نہیں ــــ وہ نہیں سوئیں گے نہیں ــــ یہ ذرا سا وقت تو ملا ہے انھیں ــــ بس اب دیکھ لیں۔ پھر کہاں دیکھیں گے ..... وہ کبھی کبھی لاڈ میں چہلیں کرتیں ــــ بڑھاپے میں بھی اس کی خوش مزاجی اور نخرے نہ گئے تھے!

"سیاں جب میں مر جاؤں گی تو تم کیا کرو گے؟ روؤ گے؟"
"کون جانے تم روؤ گی یا میں روؤں گا۔"
"بر میں جانوں ہوں۔ تم نہیں روؤ گے ــــ سنگ دل ہونا ــــ سوچو گے چلو اچھا ہے پاپ کٹا ــــ لڑا کرتی تھی ــــ"
"تو نہ لڑو پھر شاید رو پڑوں ــــ"
"ارے سیاں تم نہیں روؤ گے فوراً انتظامات شروع کر دو گے ــــ

سب کو سنبھالنے میں لگ جاؤ گے ـــــ تنویر بیٹے صبر کرو ـــــ کس کے ماں باپ سدا جیتے ہیں ـــــ ارے غزالی تو میرا بڑا بہادر بیٹا ہے ـــــ دیکھ ان کی روح کو صدمہ ہوگا ـــــ خورشید بیٹی تم بڑی ہو تمھیں تو سب کام کرنے ہیں! آہ ـــــ میری لاڈلی شاہین ـــــ سچ مچ تو بے ماں کی ہوگئی۔ آمیرے کلیجے سے لگ جا اور پھر قرآن لے کر پڑھ ـــــ اس طرح بلکنے سے کچھ نہیں ہوگا عالیہ سنبھلو بچی ـــــ تمھاری پھوپھی کتنا چاہتی تھیں تمھیں ـــــ نثار ـــــ حمیدہ ـــــ رعنا ـــــ شہباز! بھئی ـــــ دیکھو اب مہمان کو رخصت کرنے کی تیاری کرو ـــــ رونے دھونے سے جانے والا واپس نہیں آتا جو زندہ ہے۔ وہ ..... موت کی ـــــ " وہ ہنس پڑے تھے ـــــ "شریر" اور پھر خود ہی چونک پڑے ـــــ یہ کون ہنسا ـــــ کیا وہ ہنس رہے تھے۔ یہ ہنسی اسی وقت آئی تھی یا پچیس برس پہلے کی آواز ان کے کان میں گونج رہی تھی ـــــ جب وہ اس کی باتوں پر ہنس پڑے تھے! چند بے قرار آنسو ان کی دھندلی آنکھوں سے لڑھک کر گالوں کی جھریوں میں اٹک گئے ـــــ

"کہاں ہیں آج وہ سب ـــــ مہرو ـــــ جن کو میں سنبھالوں ـــــ کلیجے سے لگا کر اپنے بے قرار دل کو تسکین دوں ـــــ کہاں ہیں تمھارے بچے ـــــ تمھارے عزیز ـــــ تمھارے چاہنے والے کہاں ہیں ـــــ کہاں ہیں ـــــ"

کالی چرن نے چونک کر سر اٹھایا ـــــ نظرا لپک کر ان کے پاس آکر کھڑا ہوگیا

ـــــ "میاں ـــــ میاں"

انھوں نے سر اٹھایا ـــــ "کچھ نہیں ـــــ جاؤ تم بیٹھو ـــــ"

عمر بھر کی حکم ماننے کی عادت تھی ـــــ نہ چاہتے ہوئے بھی دونوں اپنی اپنی جگہ جا بیٹھے ـــــ

اور ان کی نظر پھر بیوی کے چہرے پر جم گئی ....

آنکھوں کے گرد کی ہر چنٹ، گالوں کی ہر جھری، ہاتھوں کی ہر لکیر، سفید

بالوں کی ہر لٹ میں کہانیاں چھپی ہوئی تھیں ـــــ کہانیاں ـــــ جن کے
ہیرو بھی وہ تھے ـــــ وِلن بھی وہ تھے ـــــ ان میں چھپا ہر دکھ، ہر خوشی وہ
جانتے تھے ـــــ گزرے لمحوں کی جھلک ان کے دل میں ہلچل مچا رہی تھی۔
اپنی مشترک پچاس سالہ زندگی کے ورق کھلے ہوئے سامنے پڑے تھے ـــــ
منتشر اوراق بکھر بکھر رہے تھے......

(۳)

انھوں نے چاروں طرف دیکھا ــــ ہلکی ہلکی روشنی کمرے کی اداسی میں اضافہ کر رہی تھی۔

"آہ ــــ میں کہاں کھو گیا تھا ــــ" مہرو کا چہرہ کسی نے ڈھک دیا تھا۔ شاید رحمین سوتے سے جاگ گئی ہو گی ــــ سرہانے رکھی شمعیں آنسو بہاتے بہاتے ختم ہو رہی تھی ــــ پائینتی رکھے پھول مرجھا چلے تھے۔

"ہاں ــــ اس کے رونے والے بس یہی تو ہیں۔ یہ شمعیں یا یہ سوگوار پھول!"

وہ جو آج اپنے کو اس کا سوگ نشیں سمجھ رہے ہیں۔ اس کے غم میں نڈھال ہو رہے ہیں ــــ کیا انھوں نے اسے چین دیا تھا ــــ وہ کسی سوچ میں کھو گئے ــــ کیسی کیسی باتیں یاد آ رہی ہیں! "میری نوٹ بک کہاں ہے ــــ نسیم کے خط کہاں ہیں ــــ" انھوں نے خود سے سوال کیا اور کمر کو سہارا دے کر کھڑے ہو گئے! اس کمرے میں رہنا اب ان کے لیے

بڑا کٹھن تھا ـــــ لگتا تھا مہرو سامنے کھڑی کہہ رہی ہے "جاؤ ـــــ جاؤ۔ اسی چھنال کے پاس جاؤ ـــــ میں تمہاری کون ہوں ـــــ" اُف خدایا وہ کیا کریں ؟

"رحیمن بوا ـــــ رحیمن بوا"

رحیمن بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور سر پر ہاتھ مار کر رونے لگی "ہائے میں نصیبوں جلی پڑی سو رہی تھی ـــــ ہائے میری بیوی کے پاس کوئی نہیں اور میں پیاروں پیٹی سو گئی ـــــ"

"بوا ـــــ جاؤ ـــــ وہیں بیٹھ کر قرآن پڑھو ـــــ میں ذرا دوسرے کمرے میں ـــــ"

"ہاں میاں میں صدقے ذرا کمر سیدھی کر لو ـــــ تمہارا جی آپ اچھا نہیں۔ ہائے بیوی کتنا خیال تھا تمھیں میاں کا ـــــ کبھی رات کو جاگنے نہ دیتیں۔ ہائے بیوی، میاں کا حال دیکھو ـــــ" وہ گھبرا کر باہر نکل آئے ـــــ بیٹھک میں جھانکا ـــــ اختر علی پرانے لمبے صوفے پر آڑے پڑے تھے ـــــ

"بچارا اختر ـــــ اس زمانے میں پرانے دوست ہی ساتھ دیتے ہیں۔ اس کا بھی بڑھاپا ہے۔ کمزور ہے مگر گھر تک نہیں گیا ـــــ بھابی اکیلی ہیں اس کا خیال نہیں کیا ـــــ خدا جانے کھانا بھی کھایا یا نہیں ـــــ"

ایک دم ان کے پیٹ میں ہوک سی اٹھی۔ آنتیں جیسے ایک دوسرے کو کھائے جا رہی تھیں۔ آگ سی لگی ہوئی تھی!

کیا انھیں بھی بھوک لگی ہے؟

"نہیں نہیں ـــــ کھلانے والی آج بے فکر ہو کر سو گئی ہے ـــــ کبھی رات کو بھوکا نہیں رہنے دیتی تھی ـــــ ایک گلاس دودھ اور اوالٹین ہی زبردستی پلا دیتی ـــــ "رات کو بھوکا نہیں رہنا چاہیے" کھانے کے تصور سے انھیں زور سے ابکائی آئی اور پیٹ کے بیچ میں شدید درد کی لہر اٹھی۔

برامدے کی سیڑھی پر بیٹھ کر انھوں نے دوپہر کا کھایا پیا نکال ڈالا ——— صراحی سے پانی لے کر کلی کی اور اٹھے تو سارا جسم سردی سے کمزر رہا تھا ——— سامنے ہی ان کے ذاتی کمرے کا دروازہ تھا ——— اس لمبے سے برامدے میں برابر برابر چار کمروں کے دروازے تھے ——— ایک بیٹھک کا ——— اور ایک ان کے کمرے کا ——— ایک ان کا اور مہرو کا مشترک کمرہ اور ایک بیوی کا اپنا کمرہ جس میں وہ ان کو آنے نہیں دیتی تھی ——— "عورتوں کے اپنے ہزار کام ہزار چیزیں ہوتی ہیں ——— تم مت جایا کرو میرے کمرے میں" ——— وہ چڑ کر کہتے "تو پھر تم بھی میرے کمرے میں نہ آنا کبھی" "میں تو ہزار بار آؤں گی ——— تم مجھ سے کیا چھپاؤ گے ——— کیا چھپا ہے تمھارا مجھ سے؟" وہ ہنس کر کہتی مگر اس کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا! ہنھ ——— پھر وہی خیالات ———

انھوں نے چک اٹھائی اور اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔ کھڑکی کے قریب ایک تخت پر گدا اور چھپا ہوا خوبصورت پلنگ پوش پڑا تھا اور سرہانے بتلا گاؤ تکیہ اور پہلو میں دو کشن رکھے تھے۔ جب وہ تنہائی میں کچھ پڑھنا چاہتے تو یہیں آ کر لیٹ جاتے تھے۔ دوسری طرف پرانی وضع کی دراروں والی لکھنے کی میز پر کتابیں، قلم دوات، پانی کا گلاس جو موتیوں کے گلاس پوش سے ڈھکا ہوا تھا، اسی طرح دھرا تھا جس طرح آٹھ دن پہلے مہرو نے ان کے لیے لا کر رکھا تھا ——— ایک طرف آتش ٹرے اور سگریٹ کا پیکٹ بھی موجود تھا ——— برابر کی الماری میں کتابوں کے علاوہ نیچے کے خانے میں کئی لکڑی اور ٹین کے صندوقچے رکھے ہوئے تھے اور ایک آرام کرسی اور دو چھوٹی کرسیاں میز کے آس پاس دھری تھیں۔ آرام کرسی پر مہرو کے ہاتھ کے بنائے ریشمی کشن اوپر نیچے رکھے تھے جن کی پھول اور پتیوں کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا مگر نزاکت اور نفاست ——— یہ سہا برس گزر جانے

سے بعد بھی ویسی ہی تھی!

وہ سر پکڑ کر میز کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے...... چکر آ رہا تھا — انھوں نے سر میز پر لٹکا دیا...... مگر گردن اکڑی جا رہی تھی — گھبرا کر سر اٹھایا اور میز کی درازوں کو بے ارادے کھولا اور بند کیا — اور پھر اٹھے — سب سے نیچے کا صندوقچہ جس میں ایک زنگ خوردہ قفل پڑا تھا، گھسیٹ کر زمین پر ڈال دیا تو اس کے اوپر دھرے دو صندوقچے دھڑام سے گرے — ایک لمحہ کو وہ گھبرا گئے — ابھی مہرو کی آواز آئے گی "کیا گرایا؟ ہر وقت کچھ نہ کچھ گراتے رہو ہو —" اور پھر آ کر چیزیں ٹھیک کرتے وقت بڑبڑاتی رہے گی۔ ساری عمر سلیقہ سکھاتے بیت گئی، مگر پھوہڑ آدمی کبھی سگھڑ نہیں بن سکتا — وہ — مگر — اب کون — کون کہے گا یہ؟ گر جانے دو — ہونے دو آواز — انھیں محسوس ہوا کوئی دروازے میں سے جھانک کر گیا ہے — اور کون آنے والا ہے۔ نظیرا یا کالی چرن ہو گا!

صندوقچے کا قفل اتنا زنگ خوردہ تھا کہ ان کے ذرا سے جھٹکے دینے پر ہاتھ میں آ گیا — وہ اسے ہمیشہ مقفل رکھتے تھے — مہرو کہتی کون سی دولت چھپا رکھی ہے اس میں — وہ ہنس کر ٹال دیا کرتے تھے — "سرکاری کاغذات ہیں پرانے —" وہ ان کو شک بھری نظروں سے دیکھتی مگر کچھ بولتی نہیں تھی — ہاں دولت ہی تو تھی اس وقت ان کے لیے اس میں — اور اس دولت کو وہ اسی سے تو چھپا کر رکھتے تھے — کتنی بار ارادہ کیا کہ ان سب کو ضائع کر دیں — آگ لگا دیں — مگر — مگر وہ کون سی چیز تھی جس نے پچاس سال تک ان سے اس سرمایہ کی حفاظت کرائی تھی!

انھوں نے ڈھکنا اٹھایا۔ بجلی کی روشنی میں گرد کا ایک ننھا سا بادل اٹھا — کاکروچ، جھینگر اور ننھے ننھے کیڑے نکل کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ انھوں نے پاس پڑا کوئی کپڑا اٹھایا اور اندر سے جو چیزیں نکلتی گئیں انھیں

جھاڑ جھاڑ کر الگ رکھتے گئے ــــ یہ رنگ اڑے ہرے ریشمی ربن میں لپٹے لفافوں کا بنڈل تھا ــــ پھولدار گلابی لفافے جن کا رنگ بدل کر مٹیالہ ہو گیا تھا مگر پچاس برس کی طویل مدت بھی اس بھینی خوشبو کو اڑا نہ سکی تھی جو ان خطوں میں سے اب بھی نکل رہی تھی۔ بنڈل کے نیچے ایک ہرے اور سنہرے رنگ کی کاپی کے سائز کی ڈائری تھی ــــ ڈائری ــــ جس کا اس زمانے میں نیا نیا رواج ہوا تھا ــــ انھوں نے نئے سال پر بڑے شوق سے دو ڈائریاں خریدی تھیں۔ ایک لال، سنہری اور ہری تھی۔ وہ انھوں نے "اپنی ساری محبت کے ساتھ" "تمھارے چاہنے والے کی طرف سے" نسیم کو پیش کی تھی۔ یہ دوسری اپنے لیے خریدی تھی جس میں وقتاً فوقتاً وہ اپنے خیالات اور تاثرات لکھ لیا کرتے تھے۔

خطوں کو جوں کا توں رکھ کر انھوں نے ڈائری کو کھولا ــــ چند کرم کتابی ان کے اوپر گر پڑے اور وہ سب کچھ بھول کر اپنے کپڑے جھاڑنے لگے۔ ڈائری ان کے ہاتھ سے زمین پر گر گئی اور دو تصویریں اس میں سے باہر نکل پڑیں! کانپتے ہاتھوں سے انھوں نے یہ تصویریں اٹھائیں ــــ ایک ان کی جوانی کی تصویر تھی۔ ایک خوبرو، چھریرے جسم، گھنے گھونگھریالے بالوں والا نوجوان اس دھندلے، بدرنگ اور مٹیالے کاغذ میں کھڑا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ تھے؟ آج ان کا جسم بھدا ہو گیا ہے، کمر جھکنے لگی ہے، سر کے بال سفید ہیں ــــ اور آنکھیں آہ! یہ بڑی بڑی آنکھیں جن کی شان میں نسیم بے تکلف شعر پڑھا کرتی تھی اور ــــ جن کی ــــ جن کی تعریف شرما کر، لجا کر مہرو بھی کیا کرتی تھی دھندلا چکی ہیں، چندھی ہو گئی ہیں، موٹے شیشوں نے ان کو کس قدر بدنما بنا دیا ہے!

اور یہ ــــ یہ ــــ انھوں نے دوسری تصویر پر نظریں جما دیں! بھرے بھرے جسم والی نازنین جس کے بھورے لمبے بالوں کی دو چوٹیاں

سینے پر لہرا رہی تھیں۔ اپنی شربتی آنکھوں سے جیسے ان کو گھور رہی تھی۔ سنہری بال، سنہری آنکھیں، سنہری گھنی پلکیں ــــ سنہرا رنگ اور سنہری باتیں ــــ وہ جو کبھی ان کی جان تھی ــــ جس کے تصور سے بھی دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ جس کی باتیں کانوں میں شہد ٹپکاتی تھیں ــــ جس کی مسکراہٹ دل پر بجلیاں گراتی تھی ..... وہ جو کبھی ان کی زندگی کی سب سے خوبصورت سب سے پیاری، سب سے ٹھوس حقیقت تھی!

انھوں نے کمبل جسم پر لپیٹ لیا ــــ تخت پر لیٹ کر گاؤ تکیہ پر سر ٹکا دیا ...... کمر میں سخت درد ہو رہا تھا ــــ جب یہ درد بڑھتا تھا تو مہرو اپنے کومل ہاتھوں سے ــــ جو اس بڑھاپے میں بھی کومل، نرم اور سفید تھے ــــ دھیرے دھیرے آئی ڈکس کی مالش کیا کرتی تھی ــــ یہاں تک کہ درد مٹ جاتا وہ اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے لبوں سے لگا لیتے اور آئی ڈکس کی بو کا احساس بھی نہ ہوتا۔

"بس خدا کے لیے! جوان بچوں کے باپ مگر ابھی تک چونچلوں کی عادت نہیں گئی ــــ پوتے نواسے بھی جوان ہو گئے ہیں سیّاں تمھارے ــــ"

وہ بظاہر خفا ہوتی مگر اس کے لہجے میں جو فخر، آنکھوں میں پیار کی جو چمک اور انداز میں جو ناز ہوتا وہ کیا ان سے چھپا رہ سکتا تھا۔

"جوان بچوں کے باپ کا دل بھی جوان ہے بیگم صاحب۔ پھر خود تم ــــ تم ــــ"

"تم تم کیا کرتے ہو ــــ میں نے کیا کیا ہے؟"

"تم اب بھی دلکش ہو، خوبصورت ہو۔ جوان ہو ــــ"

"جھوٹے"

"مجھے تو لگتی ہو!"

"مگر تم مجھے بوڑھے لگتے ہو!"

"تو پھر یہ سنگار کس لیے کرتی ہو ــــ یہ چوڑیاں، یہ کانوں کے جھمکے، گلے میں زنجیر ــــ اور ریشمی کپڑوں میں عطر کیوں لگاتی ہو ــــ کیا کسی اور کو دکھانے کے لیے ــــ ؟؟" وہ چھیڑتے "بے شرم ہٹو پرے ــــ بکتے چلے جاتے ہو ــــ مجھے کسے دکھانا ہے ــــ بڈھے ہو یا جوان میرے تو صرف تمھیں ہو ــــ ہاں یہ کہو تمھیں اپنی وہ وہ..... حرافہ یاد آتی ہوگی ــــ جس کے عشق میں....." وہ جھینپ جاتے ــــ کتنے سال گزر چکے ہیں۔ دنیا بدل گئی ــــ مگر مہرو کے دل سے رقابت کی جلن نہیں گئی۔ نصف صدی کی رفاقت، خلوص، پیار نے اسے یہ تو یقین دلایا کہ میں اسے پسند کرتا ہوں ــــ چاہتا ہوں ــــ مگر یہ رشک و رقابت کا جذبہ؟ کیا عورت ــــ نہیں بیوی کے لیے اس سے بڑا کوئی اور دکھ نہیں ہوتا؟ وہ سب کچھ بھول جاتی ہے ــــ فرضی یا اصلی رقیب کو نہیں بھلا سکتی؟

وہ چاہتے تھے کہ اور سب بھول جائیں۔ ماضی کے اس سنہری دور میں کھو جائیں جب نسیم ان کی تھی، وہ نسیم کے تھے ــــ مگر ــــ مگر ــــ مہرو ــــ مہرو ــــ ــــ

انھوں نے نوٹ بک کی ورق گردانی شروع کی۔ نصف صدی پرانی یادوں میں ڈوب جانے کے لیے۔ روح فرسا آج کو بھول جانے کے لیے ــــ یہ باقاعدہ ڈائری نہ تھی۔ ہاں جب کوئی حادثہ یا واقعہ دل پر بہت اثر کرتا تو بھڑاس اس کے صفحات پر نکلتی تھی!

دوسرے کمرے میں ان کی محبت کا جنازہ رکھا تھا۔ وہ اس کو بھلانا چاہتے تھے ــــ ان لمحوں کو زندہ کرنا چاہتے تھے جب وہ کچھ اور تھے دنیا کچھ اور تھی! زندگی کچھ اور تھی!

انھوں نے شروع کے صفحات کھولے۔ چند صفحے خالی تھے! کچھ پر پنسل سے شعر لکھے ہوئے تھے ــــ پلٹ دیے ــــ دو چار ورق اور خالی

تھے ——— پھر بہت سے صفحات بھرے ہوئے تھے۔ نیلی روشنائی سے لکھے ہوئے
——— اب بھی وہ لفظ روشن تھے! بہت برسوں پہلے کی تاریخ پڑی ہوئی تھی:
بھلا یہ کیا بات ہے؟ ماں جی کے ارمانوں پر میں کیوں اپنی زندگی
بھینٹ چڑھاؤں۔ ہوگی ماموں کی بیٹی۔ صورت ..... وہ کہتی ہیں بڑی پیاری
ہے، مجھے تو ایک جھبری سی باؤلی سی لونڈیا یاد ہے، جو مجھ سے لڑا کرتی تھی۔
وہ کہتی ہیں بڑی سگھڑ ہے! بہت کام کی ہے ——— شرمیلی ہے ——— نیک
ہے ——— دنیا کی ہر خوبی مہرخ میں ماں جی کو نظر آتی ہے..... ابھی بہو بن
کر نہیں آئی نا اس لیے ——— وہی تو کہا کرتی ہیں جب تک رہی بہو کنواری،
ساس رہی واری ——— بہو کا آیا ڈولہ، ساس کے لگا گولا۔ جب تک میرا
بیاہ نہیں ہوتا ارمان اور محبت پھٹی پڑ رہی ہے! جب بیاہ کر لوں گا تو
آنے والی میں، سو سو کیڑے ڈالیں گی۔ خیر وہ تو جو بھی آئے گی ماں سے اس
کا نباہ نہیں ہو سکتا ——— وہ مجھے دنیا میں سب سے زیادہ چاہتی ہیں
——— اور عورت اپنی محبت میں کوئی شریک برداشت نہیں کر سکتی ——— چاہے
وہ ماں ہی کیوں نہ ہو ——— پھر جب میں ان کے مزاج کو اب تک نہیں سمجھ پایا
تو وہ جو نئی آئے گی وہ کیسے ان کو خوش رکھ سکے گی؟ اور تو اور ان کی یہ
پاکی ناپاکی کا جنون ہی آدمی کو پاگل کر دیتا ہے! تبھی تو اباجان نے انھیں
چھوڑ کر دوسرا بیاہ کر لیا ——— مگر لوگ تو کہتے ہیں اباجان نے نہیں خود
ماں نے ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیا، جب انھیں پتا چلا کہ ان کے ایک اور بیوی
بھی ہے ——— ماں اپنی نماز روزے عبادت اور طہارت میں مگن ہیں ———
اباجان اپنے گھر میں خوش ہیں۔ مصیبت تو مجھے اٹھانی پڑی عمر بھر۔ دس برس
کی عمر ہی سے انھیں میرے "چال چلن" کی فکر پڑ گئی۔ کہاں گیا تھا ———
کس سے ملا تھا ——— اسکول سے دیر سے کیوں آیا۔ باوا کے پاس گیا تھا
کیا؟ وہ مردار وہاں تھی؟ تجھ سے تو نہیں بولی ——— بس روز روز جانے

کی ضرورت نہیں ہے! کبھی منھ سونگھتیں کہ سگریٹ تو نہیں پیا ہے۔ بڑے بھیا سے تاکید رہتی "میاں اپنے چھوٹے بھائی کا خیال رکھنا ——— میری تو اندھے کی ایک ہی لکڑی ہے ———" ہنھ بڑے بھیا ——— ان کے کرتوت تو جانتی نہیں اور انھیں اتالیق بنایا میرا!

ابا جان مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ ان کا بھی تو آخر میں ایک بیٹا ہوں۔ امی جانی کے تو کوئی بچہ ہے نہیں ——— جب بھی جاتا ہوں دونوں کس قدر محبت پیار کی بارش کرتے ہیں۔ امی جانی طرح طرح کی چیزیں کھلاتی ہیں ——— ابا جان روپے خرچ کو دیتے ہیں۔ خوب باتیں کرتے ہیں۔ لطیفے اور قصے سناتے ہیں ——— ایک ماں ہیں چڑچڑی، غصہ ور۔ ہمیشہ نصیحت فضیحت ایک امی جانی ہیں کیسا اچھا مزاج ہے ——— اور کیسی شاندار صورت ہے ——— لوگ کہتے ہیں ابا جان نے ان کی آواز پر عاشق ہو کر ان سے نکاح کیا تھا۔ ابا جان ٹھہرے شاعر ——— عاشق مزاج تو ہونا ہی تھا انھیں ——— اور اب جب امی جانی کی آواز اس غضب کی ہے کہ جب وہ ابا جان کی غزل لحن سے پڑھتی ہیں تو بس سماں بندھ جاتا ہے تو جوانی میں کیا غضب کی آواز اور کیا حسن ہو گا ان کا ——— کیسی پاٹ دار اور پُردرد آواز ہے ——— وہ گاتی ہیں تو بس میں ان کا منھ دیکھا کرتا ہوں! ہنستی ہیں تو منھ سے پھول جھڑتے ہیں ———!

سب کہتے ہیں میرا مزاج اپنے باپ پر گیا ہے۔ ہنس مکھ خوش باش کھلنڈرا ——— کسی چیز کا روگ نہ لگانا، حال میں مگن رہنا ——— نہ ماضی کا غم نہ مستقبل کی فکر!! شاید یہی بات ماں جی کو بری لگتی ہے ——— سمجھتی ہیں میں بھی ابا جان کی طرح "بدراہ" ہو جاؤں گا ——— بدراہ کیوں ہوتے ابا جان نکاح ہی تو کیا ہے ——— آخر چار نکاح جائز ہیں! مگر ابا جان بھی تو یہی کہتے ہیں۔ "بدیٹا اپنی ماں کا خیال

رکھا کرو ۔۔۔ دیکھو کبھی ان کا دل نہ توڑنا ۔۔۔ وہ مزاج کی بری سہی دل کی بہت اچھی ہیں ۔۔۔ اور بہت دکھی ہیں بے چاری ۔۔۔ "خوب، خود تو ان سے پیچھا چھڑا کر دوسرا بیاہ رچا لیا اور مجھ پر یہ تاکید!

اس نے ڈائری بند کر دی اور سوچنے لگا ۔۔۔ امی جانی کے پاس جب سے نسیم آکر رہی اس کا اور بھی زیادہ جی لگنے لگا تھا ۔۔۔ نسیم ان کی بہن کی بیٹی تھی۔ عمر میں شاید اس سے سال دو سال چھوٹی ہوگی ۔۔۔ گھر میں بڑی رونق ہوگئی تھی۔ لڑکپن میں تو وہ کبھی کبھی آیا کرتی تھی مگر پھر انھوں نے اسے مستقل اپنے پاس بلالیا۔ اپنی بیٹی بنالیا ۔۔۔ وہ گھر کا کام بھی کرتی تھی۔ امی جانی کی خدمت بھی کرتی جب وہ جاتا تو دونوں خوب گھل مل کر باتیں کرتے۔ وہ بڑی ذہین، تیز، اور خاصی پڑھی لکھی تھی۔ شاعروں کے دیوان اسے ازبر تھے۔ شررؔ، سرشارؔ، رسواؔ اور جانے کن کن لوگوں کے قصے پڑھے ہیں، شوق کی مثنویاں یاد ہیں۔ ایسے برمحل شعر پڑھتی ہے کہ جی بھڑک جاتا ہے! ایک دن مجھے پان دیتے ہوئے بولی ؎

یاد اپنی تمھیں دلاتے جائیں
پان کل کے لیے لگاتے جائیں

میں ہنس پڑا تھا ۔۔۔ میں بھی یہیں ہوں ۔۔۔ تم بھی یہیں ہو جا کہاں رہے ہیں ۔۔۔

مہینے گزرے ۔۔۔ سال گزرے اور میری اور نسیم کی دوستی بڑھتی گئی۔ ماں جی کو بھی یہ خبر مل گئی کہ امی جانی کی کوئی خوبصورت بھانجی ان کے پاس رہتی ہے ۔۔۔ قیامت آگئی ۔۔۔ میرے آنے جانے پر پابندی لگ گئی ۔۔۔ اور میری شادی جلد سے جلد کرنے کی فکر! اُف! کیا کیا نہ ہوا اس زمانے میں!

انھوں نے پھر ڈائری کے کچھ ورق پلٹے:

"سمجھ میں نہیں آتا۔ ماں جی تو کیا، ابا جان تک نسیم سے میری شادی کے

خلاف ہیں۔ ماں کو تو جلنا ہی ہے کہ وہ امی جانی کی بھانجی ہے۔ مگر ابا جان کیوں خلاف ہیں؟ بڑی بھابی کہتی ہیں وہ لوگ ہم سے نیچی ذات کے ہیں! ہونھ ہم کیا ہندو ہیں جو ذات پات کو مانتے ہیں۔ ارے بھئی مسلمان وہ بھی ہے ــــ تم بھی ہو ــــ ہمارے رسولؐ نے تو ذات پات، چھوت چھات، چھوٹے بڑے، امیر غریب سب کو ایک درجہ، ایک مقام دیا ہے!

ابا جان بھی خوب ہیں، خود نسیم کی خالا سے بیاہ کر لیا اور میرے لیے یہ بندشیں ہیں ــــ مگر ــــ ابا جان سے زیادہ مشکل کام تو ماں جی کو منانا ہے ــــ ایک دفعہ ماں اسے دیکھ تو لیں ــــ نسیم سچ مچ پری ہے پری۔ نرگسی آنکھیں۔ سونے کی رنگت۔ سنہری بالوں کا حسین ڈھیر سر پر ــــ ہائے اس کو دیکھ کر ہائے دل کو کیا ہونے لگتا ہے۔ جوانی سے بھرپور جسم۔ کھنکتے قہقہے، پھڑکتے فقرے! دلچسپ لطیفے اور رنگین اشعار! اور ہر جذبہ بے ساختہ! نسیم ــــ نسیم تو ایسی لڑکی ہے جس پر ہر مرد قربان ہو جانا چاہے گا۔

وہ باتیں کرتی ہے اور میں اس کا منھ دیکھتا رہتا ہوں ــــ لگتا ہوں نگاہوں ہی پرستش کرتا ہوں۔ دل کی بات زبان پر نہیں لاتا مگر وہ سب جانتی ہے۔ ــــ سب سمجھتی ہے۔ کئی بار کہہ چکی ہے "بڑی اماں سے بات کب کروگے؟" ــــ مگر ماں تو نسیم کا نام بھی نہیں سننا چاہتیں۔ ابا جان بھی اب مجھے نظروں میں رکھنے لگے ہیں۔ ہاں امی جانی کی دلی آرزو ہے کہ ہم دونوں کا بیاہ ہو جائے۔ کئی بار انھوں نے کہا بھی "بیٹا اپنی ماں کو تم راضی کر لو۔ تمہارے ابا جان کو میں منالوں گی ــــ" مگر ماں کے سامنے تو میرا دم نکلتا ہے!

انھوں نے دو چار صفحے پلٹے۔۔۔۔۔

"آج پہلی بار نسیم کو جلال میں دیکھا ــــ اُف وہ اس کا غصے سے سرخ رنگ، اور چھلکتی آنکھیں، تنا ہوا جسم اور تیوری پر پڑے تین بل۔

"جاؤ۔ بے وقوف، بزدل، بے وفا، ــــ جاؤ ــــ تم اس پندرہ سولہ برس کی چھوکری کو پالو جاکر ــــ خبردار اب میرے پاس نہ آنا کبھی ــــ"

وہ اور بھی پیاری لگ رہی تھی۔ میرا دل چاہا اسے اپنی باہوں میں بھینچ لوں اور پھر کبھی نہ چھوڑوں ــــ مگر باہر ابا جان کھانا کھا رہے تھے اور اندر امی جانی غصے میں بھری بیٹھی تھیں۔ اس نے پھر صفحہ پلٹا۔

"میں کیا کرتا نسیم ــــ کیا کرتا ــــ میں نے لاکھ انکار کیا ــــ بڑے بھیا سے کہا، اپنی چچی کو سمجھائیں ــــ میں مہ رُخ سے بیاہ ہرگز نہیں کروں گا ــــ وہ مجھ سے دس بارہ برس چھوٹی ہے ــــ مجھے پسند نہیں ہے ــــ بڑی بھابی سے کہا، زبان ماں جی نے دی ہے، وہ جانیں ــــ ان کی بھتیجی کو بر نہیں مل رہا تو میں کیا کروں؟ میں نے بڑی بھابی سے بڑی بے حیائی سے کہا آپ نے کبھی نسیم کو دیکھا ہے ــــ وہ چڑھتا ہوا آفتاب ہے ــــ کھلا ہوا پھول ہے، ہرا بھرا درخت ہے ــــ اس کا اور مہ رُخ کا مقابلہ ہی کیا؟"

بڑے بھیا اور بڑی بھابی ہر وقت میری جان کو آتے رہتے ہیں۔ بھابی مہ رخ کی تعریفیں کرتی ہیں اور بھیا ماں جی کی خفگی کا ذکر اور پھر وہی ماؤں کا پرانا ہتھیار۔ میں زہر کھالوں گی مگر نسیم اس گھر میں نہیں آئے گی ــــ اُف ماں جی کا وہ عتاب۔ ابا جان کا غصہ ــــ ان کا کہنا تھا وہ نسیم کے ساتھ اس کی خالہ کو بھی گھر سے نکال دیں گے ــــ ہائے یہ جابر مرد ــــ خود غرض مرد!

پھر میں کیا کرتا نسیم۔ تمہاری بے عزتی، تمہاری ذلت ناقدری میں برداشت نہیں کر سکتا نسیم۔ میں اپنا دل خون کر لوں گا مگر تمہیں ان بڈھے لوگوں کے ہاتھوں ذلیل اور دربدر نہ ہونے دوں گا" خود اپنی ہی سسکیوں سے وہ چونک پڑے۔ کون رو رہا ہے؟ کون ہے یہاں نسیم؟

نسیم ــــ انھوں نے چاروں طرف دیکھا ــــ نسیم کہاں ہے؟ وہ پچاس
برس پہلے کی دنیا میں کھو گئے تھے ــــ شاید سو گئے ہوں گے ــــ چاند
کی ملگجی چاندنی اور بھی میلی ہو گئی تھی اور کھڑکی میں سے مغرب کی اور زرد زرد
چاند افق کے قریب پہنچ چکا تھا

آہ! ان کی زندگی کا چاند بھی تو غروب ہو گیا!

انھوں نے، ڈائری، جو ان کے سینے پر گر پڑی تھی، پھر اٹھالی ــــ اور جہاں
سے کھل گئی پڑھنے لگے۔ "نسیم کے خط پہلے بھی آتے تھے اور اب تو روز آرہے
ہیں۔ اختر علی کے ہاسٹل کا پتا میں نے اسے دیا تھا ــــ خوبصورت گلابی
پھولدار کاغذ اور لفافے جو میں نے اسے بھیجے ہیں ــــ اس کی موتیوں
جیسی تحریر ــــ کیسے رومانی خط ہیں۔ محبت کی شراب چھلکی پڑتی ہے ــــ
گلاب کے عطر میں بسے ہوئے یہ خط ــــ ہنہ مہ رخ ــــ دس جنم لے
تو ایسے خط نہیں لکھ سکتی۔ دلہن امی نے اسے اپنے ماں باپ کے پاس بھیج
دیا ہے۔ مگر وہ ابھی مایوس نہیں ــــ پھر بھی ــــ کہیں اس کی شادی نہ
طے ہو جائے ــــ نہیں میں اپنا رقیب برداشت نہیں کر سکوں گا ــــ
مار ڈالوں گا اسے ــــ مگر اس کا ہو گا کیا؟ میں اس سے شادی نہیں
کر سکتا ــــ تو ــــ تو ــــ

کیوں نہیں کر سکتا؟ ابا جان نے بھی تو دوسرا بیاہ کیا ہے ــــ مہ رخ سے
ماں جی بیاہ کر دیں ــــ مگر میں رہوں گا اسی کا ــــ اور پھر ــــ
پھر تو کہہ دوں گا تو نسیم سے شادی کر لوں گا ــــ کیا کروں ــــ
کس سے فریاد کروں ــــ کوئی میرا ہمدرد نہیں ــــ امی جانی بھی خفا
ہو گئی ہیں ــــ اور یہ بڑے بھیا ــــ میرا سایہ بن گئے ہیں! ہنہ جیسے
میں جانتا ہی نہیں کہ بڑی بھابی جیسی حسین اور فرشتہ صفت بیوی کو چھوڑ کر
وہ کن کوچوں میں ٹھوکریں کھایا کرتے ہیں ــــ اس وقت سو گئے تو چار

سطریں لکھ پایا۔

پھر بہت سے صفحے سادے تھے۔

ان سادہ صفحوں پر اس کی ناکام محبت اور اس کربناک زمانے کی ان کہی باتیں لکھی تھیں جو وہ کسی سے نہ کہہ سکتا تھا ـــــ خود اپنے سے بھی نہیں۔

ہاں، ہر ہر صفحے پر نسیم کا چہرہ دمک رہا تھا

اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا ـــــ کتنا بے وقوف، کتنا جذباتی، کتنا ناتجربہ کار تھا وہ اس وقت! اس جوانی کے وقتی جوش اور ابال کو محبت سمجھتا تھا۔ عشق جس میں مجنوں جنگل کی خاک چھانتا ہے۔ فرہاد پتھر کاٹتا ہے اور سوہنی کچے گھڑے کے سہارے ـــــ بہت سے صفحے پلٹ ڈالے ـــــ ایک صفحہ پر اب سے انچاس برس پہلے کی تاریخ پڑی تھی ـــــ اس کی شادی کے بعد کی تاریخ ... ۱۵ شعبان ـــــھ

"اماں کے ارمانوں کے پورا ہونے کا دن آخر آ ہی گیا ـــــ دھوم دھام! بری۔ چڑھاوا۔ پھولوں کا سہرا سنہرا جامہ اور صافہ ..... باجہ اور گاجہ۔ گھوڑے پر اس کے آگے بیٹھا چھوٹے بھائی جان کا چھ سال کا بچہ ـــــ اور ساتھ ساتھ خاندان بھر کے بزرگ، عزیز اور دوست اور چھوٹے چھوٹے بچے ـــــ سب خوش و خرم ـــــ ہنستے بولتے ـــــ بس ایک وہ تھا ـــــ وہ تھا جس کا دل خون ہو رہا تھا ـــــ جیسے نسیم سامنے کھڑی دہرا رہی تھی ـــــ بزدل ـــــ بے وفا ـــــ

نکاح ہوا ـــــ اکیس ہزار مہر پر ـــــ مٹھائی بٹی ـــــ چھوارے لٹے ـــــ وہ دوستوں اور بھائیوں کے جھمگٹ میں دلہن کے گھر میں داخل ہوا ـــــ رشتے کی بہنوں نے سر پر آنچل ڈالا ـــــ کاش آج اس کی آپا زندہ ہوتیں تو شاید وہ اس کے دل کی بات سمجھ پاتیں! بڑی بھابی سائے کی طرح ساتھ تھیں .... گھر بھرا ہوا تھا ـــــ ڈومنیاں گا رہی

تھیں ۔ رسمیں کر رہی تھیں ــــ آرسی مصحف کا جھنجلا بھلا اماں کیوں نہ کرتیں ــــ ایک لال گھڑی لا کر میرے سامنے رکھ دی گئی ــــ بیچ میں آئینہ رکھا گیا۔ ہمارے سروں کے اوپر کسی کا لال زر کار دوپٹہ ڈال دیا گیا۔ بہت سی لڑکیاں اور جوان عورتیں کچھ کہہ رہی ہیں، قہقہے لگ رہے ہیں، فقرے کسے جا رہے ہیں مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ــــ بڑی بھابی ریشمی کارچوبی غلاف چڑھا کلام پاک ہاتھ میں دے کر کہتی ہیں ''اسے کھولو، میں کھولتا ہوں "سورہ اخلاص نکالو ــــ" پھر خود ہی نکال کر میرے ہاتھ پر کلام پاک رکھ دیتی ہیں "سورۂ اخلاص پڑھ کر بسم اللہ کر کے دلہن کا منھ دیکھو ــــ" اِدھر اُدھر سے آوازیں آ رہی ہیں۔ "کہو بیوی آنکھیں کھولو میں تمہارا غلام ہوں ــــ"

"ہاں صورت بھی غلاموں کی سی تو ہے"

"مہ رُخ کا غلام بن کر تو رہیں گے دولہا بھائی"

"اے منھ سے کچھ بولو نا ــــ چاند سی دلہن یوں ہی تو نہیں مل جاتی ہے" میں خاموش بیٹھا تھا ــــ آئینہ میں میں نے دلہن کی شکل دیکھنے کی کوشش نہیں کی ــــ ذرا دیر بعد بھابی کے ہاتھ میں کلام پاک واپس پکڑا دیا۔ ہاں سورۂ اخلاص ضرور پڑھی وہ بھی بے ارادہ!

اور پھر رخصتی کی تیاری شروع ہوئی ــــ سب کھڑے بیٹھے رو رہے تھے ــــ میری ساس بیٹی کو کلیجے سے لگائے بلک بلک کر رو رہی تھیں ــــ ڈومنیاں گا رہی تھیں :-

چہرہ نہ کیجیو اداس ــــ میاں میں تو دوارے رہوں گی!
اپنی ساسوں کو میں اماں کہوں گی تا کہ اماں نہ آئیں یاد
میاں میں تو دوارے رہوں گی
چہرہ نہ کیجیو اداس ــــ

اپنے سسر کو میں ابا کہوں گی کہ ابا نہ آئیں یاد......

میاں میں تو دوانے رہوں گی !

چہرہ نہ کیجیو اداس.......

ہاں ـــــ بس اسے یہ اماں - یہ ابا اور یہ زیور اور کپڑا ہی تو ملے گا!

میرے ہاں دلہن کو گود میں اٹھانے کی رسم نہ تھی - بہت لوگوں نے کہا مگر ماں جی بگڑ اٹھیں "اے بس رہنے دو یہ بے شرمی ـــــ میرے ہاں یہ رواج نہیں ہے !" میری ساس تو ایسی بے زبان اور نیک بیوی ہیں کہ کچھ کہتی ہی نہیں کبھی! بڑی بھابی گود میں اٹھانے کو آگے بڑھیں تو کسی نے ٹوک دیا ـــــ "ارے نہیں چھوٹی دلہن اٹھائیں گی" میں نے دیکھا بڑی بھابی کا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا اور وہ پیچھے ہٹ گئیں! کیوں ؟ مگر کیوں ؟ ہر کام تو بڑی بھابی کر رہی ہیں - بچا جان اور ان کی بہو اور بیٹیاں تو بس نام کو شریک ہوتے ہیں ! اور پھر مجھے یاد آ گیا اف ! بڑی بھابی کی گود سونی ہے بارہ برس بعد بھی سونی ہے ـــ اُف یہ بے درد عورتیں - یہ ظالم رواج !

آخر ہزاروں ارمانوں کے ساتھ اماں جی اپنی بہو کو بیاہ ہی لائیں ـــــ ہر ایک کہہ رہا ہے کہ رُخ کی ماں نے بہت جہیز دیا ہے بچی اماں کہہ رہی ہیں "ہاں سگھڑاپا ضرور ہے ـــــ غریب گھر کی لڑکی سگھڑ بھی نہ ہوتی ؟" یہ کیوں کہہ رہی ہیں ! مجھے تو وہاں انگوٹھی ملی - روپے ملے - دو جوڑے ملے ـــــ روپے سب اماں کے قبضے میں ہیں - مجھے کیا کرنا ہے - بیاہ ان کا ہوا ہے ـــــ میرا نہیں ـــــ تو یہ میں اپنی فرشتہ ماں کے لیے کیا کہہ گیا ـــــ بدنصیب دکھی ماں ـــــ دنیا میں کوئی خوشی نہ دیکھی - باجی بھی تو بھری جوانی بیاہ کے دو برس بعد چل بسیں...... ایک میں ہی تو ہوں ان کی زندگی کا سہارا ـــــ تو پھر اور کیا کروں - اپنے کو بھینٹ

نوچڑھا دیا ان کی آرزو پر ــــ "چھوٹی سی پیاری دلہن" بیاہ تو لائیں ــــ
باجان نے میرا نام نائب تحصیلدار کے لیے لکھوا دیا ہے ــــ کہتے ہیں
اب کمانے لگو، بال بچوں والے ہو جاؤ گے ــــ ہنہ ــــ بال بچے اِدیکھیں گے
سب ــــ نہ بے اولاد رہی ان کی بہو تو سہی ــــ ہاتھ بھی نہ لگاؤں گا۔
تبسم جیسی پری کو چھوڑ کر کسی اور سے دل لگانا ــــ ناممکن ــــ ہنہ
سہاگ رات ــــ سوگ کی رات" ایک صفحہ خالی ..... اور پھر ــــ

۱۷ر شعبان سنہ ھ

تو یہ مرحلہ بھی گزر گیا۔ سارے منصوبے دھرے رہ گئے!

بہنوں، بھاوجوں اور خدا جانے کن کن عورتوں اور لڑکیوں کے دبیے دبیے ہنسی کے فواروں ہلکے پھلکے فقروں اور شرمیلی جھکی جھکی آنکھوں کے ساتھ میرے سر پر اپنے آنچل ڈال کر وہ مجھے اُس شہ نشین میں لے آئیں جو ماں جی نے خاص طور پر آج کے لیے سجوائی تھی۔ ہمارے پرانی وضع کے گھر میں کمرے نہ تھے۔ دالان تھے۔ چوبارے تھے، اک دوسرے تھے دو صحنچیاں تھیں اور بڑے دالان میں یہ "شہ نشین" جن کے پتلے پتلے ستون، رنگین چھت اور ان پر پڑے رنگین ریشمی پردے بہت اچھے لگا کرتے تھے مجھے۔ ماں جی کہا کرتی تھیں تیرے لیے یہ شہ نشین ہے ــــ میری والی صحنچی نہیں۔ نوج میری بہو کا نصیب میرا جیسا ہو..... وہ کیا جانیں، نصیب ان کے ہاتھ میں نہیں، میرے ہاتھ میں ہے۔

ماں جی کے جہیز کا بڑا سا پلنگ جس کے پائے بے حد موٹے رنگین اور نیچے نیچے ہیں، بیچ میں بچھا تھا۔ رنگین پاؤں پر ریشمی چادر کے اوپر سیج بنا۔ بندھے تھے جس میں سہرے کی لڑیوں کی طرح سچے کلابتوں کی ڈوریاں اور سنہری ہڑیں لٹک رہی تھیں ...... چھپر کھٹ کے سرہانے ایک رنگین تپائی پر چمکتے سرپوش سے ڈھکی کوئی چیز رکھی تھی، دوسری

طرف صراحی اور اس پر چاندی کا گلاس دھرا تھا۔

"بھیا ساری مٹھائی خود نہ کھا جانا۔ بہو رانی کو پہلے کھلانا ہاں!"

چھوٹی بھابی نے میرے مٹھائی کے شوق پر فقرہ کسا۔

اچھا تو یہ وہ روایتی مٹھائی ہے جو آج کی رات دولہا دولہن کو کھلاتا ہے!

اور پھر یہ چڑیاں سب کی سب پھر سے اڑ گئیں۔ بس بڑی بھابی رہ گئیں۔ وہ خود آج دلہن سی بنی ہوئی تھیں۔ ان کے شاندار جسم پر ریشمی بھاری جوڑا اور جڑاؤ زیور بہار دکھا رہے تھے۔ میں نے مسکرا کر انھیں دیکھا۔ میں بچپن سے ان سے بہت بے تکلف تھا۔ وہ بیاہ کر آئیں تو پندرہ سال کی تھیں اور میں دس سال کا۔ بہت چاہتی تھیں مجھے۔

"اے ادھر کیا دیکھ رہا ہے ادھر دیکھ۔" وہ ہنس کر بولیں۔

"خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھ رہا ہوں۔ آپ اب بھی اتنی ہی حسین لگ رہی ہیں جیسی اپنی شادی کے دن ۔۔۔۔"

وہ کچھ شرمائیں کچھ مسکرائیں کچھ خوش ہوئیں۔ "بکو مت ماں کی برابر بھاوج سے مذاق کرتا ہے ۔۔۔۔"

"بھابی آپ سے بڑھ کر خوبصورت ۔۔۔۔"

"حسن تو آج دیکھو گے کس کا نام ہے ۔۔۔۔" پھر وہ ذرا رکیں ان کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نظر آرہے تھے۔

"بھیا"

"بھابی"

وہ جھکیں اور آہستہ سے بولیں "سہیل۔ دلہن ابھی نادان ہے بھولی ہے ــــ اس کا خیال رکھنا۔ یتیم بچی ہے۔ دیکھو دل نہ دکھانا اس کا ــــ تم خوش نصیب ہو کہ ایسی دلہن ملی۔" اور پھر وہ ایک جھپاکے

کے ساتھ باہر تھیں اور پردہ برابر کر رہی تھیں۔

شہ نشین، عطر، پھولوں اور جانے کن کن خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔ چھپر کھٹ کے بیچوں بیچ "میری دلہن" سر جھکائے بیٹھی تھی۔ کار چوبی دوپٹہ کا لمبا سا گھونگھٹ بستر کو چھو رہا تھا..... اور جالی کے دوپٹے میں سے بھرے اوپر لگے جھومر کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ ایک چھوٹے سا گدرایے گورے ہاتھ نے جس میں مہندی رچی تھی اور سونے کی انگوٹھیوں کے ساتھ چاندی کے بہت سے گھونگھرو والے چھلے ہلکے ہلکے بج رہے تھے پلنگ کی پٹی کو زور سے پکڑ رکھا تھا......

ماحول کا اثر مجھ پر ہونے لگا۔ اس بچاری کا کیا قصور جب میں اپنی ماں کی مرضی کے ہاتھوں مجبور ہو گیا۔ ستائیس برس کا جوان پڑھا لکھا مرد ـــ تو وہ تو کم عمر لڑکی ہے...... بے زبان مجبور ـــ اس سے خفگی؟ نہیں وہ بچاری کیا کرتی ـــ میں اسے سب کچھ بتا دوں گا ـــ سب کچھ۔ کیوں ایک معصوم لڑکی کو دھوکے میں رکھوں۔ جب میں اس سے محبت نہیں کر سکتا اسے کچھ دے نہیں سکتا تو پھر ـــ تو پھر مجھے کیا حق ہے...... میں آہستہ سے چھپر کھٹ پر بیٹھ گیا۔ سرخ گٹھری میں ذرا سی لرزش ہوئی۔ ہاتھ کے چھلوں کے گھنگھروؤں اور پیروں کی پازیب بج اٹھی۔

"مہ ـــ رخ ـــ مہ رُخ" میری آواز جذبات سے عاری سپاٹ تھی بالکل۔

"جی" دھیمی سی آواز آئی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ یہ اور دلہنوں کی طرح چپ کیوں نہیں رہی؟

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں!"

"کہیے" آہستہ سے پھر جواب ملا۔ میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔

"تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔ یہ گھونگھٹ ہٹا دو تو پھر آرام سے بات چیت

کریں!" مجھے امید تھی وہ اور نیچے جھک جائے گی۔ مگر وہ ذرا سا کسمسائی پھر ہاتھ سر پر لے جا کر دوپٹہ کا پلو سر کا کر ذرا اونچا کر دیا۔ بس اتنا کہ اب مجھے اس کی نتھ کا ایک سرا اور اس میں چمکتے ہوئے موٹے موتی نظر آرہے تھے۔ "ماں جی کی نتھ" اور میرے دل کے اندر سے کسی نے کہا "ماں جی کی سی قسمت بھی!"

اور پھر ایک اور آواز ــــ پہلے دھیمی اور پھر بتدریج بلند ہوتی ہوئی، سینے کی ہڈیوں کو چیر کر میرے کانوں میں آنے لگی ...... نہیں ...... نہیں ... نہیں ــــ تم اس کا دل نہیں توڑو گے۔ ان کے جذبات کا خون نہیں کرو گے۔ اس کی دنیا نہیں اجاڑو گے ــــ کیوں کیا تم نے اس سے بیاہ۔ اپنی ماں سے ڈر گئے ــــ سماج سے ڈر گئے ــــ اور ایک معصوم بے گناہ پر ظلم توڑنے پر تل گئے ــــ تم اسے اپنی محبت کی داستان نہیں سناؤ گے۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ یہ آواز ــــ میں سر سے پاؤں تک پسینے میں بھیگ گیا۔ اف کس قدر گرمی ہے۔

پلنگ پر رکھا رنگین ڈنڈی کا خوبصورت ہاتھ کا پنکھا اٹھا کر میں بے ارادے جھلنے لگا۔ ان بھاری کپڑوں اور زیوروں میں کس قدر گرمی لگ رہی ہو گی۔ مگر لڑکیوں کو بیاہ کا اسی لیے تو شوق ہوتا ہے۔ پھر اس کے ہاتھ نہ اس کے سوا اور کچھ لگے گا بھی نہیں۔

اچانک مہندی لگا ہاتھ اٹھا، چوڑیاں اور دوسرے زیور چھن چھن بولے اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور میرا سارا جسم سنسنانے لگا۔

"نہیں ــــ نہیں۔"

"کیا نہیں ......؟"

"میں ...... مجھے .... نہیں ستیاں۔ خدمت .... میرا ــــ میرا کام ہے۔"

سریلی، بزم شیریں آواز "بہ سیاں" اس نے مجھے سیاں کہا سیاں؟
بے اختیار میں نے اس کا گھونگھٹ الٹ دیا۔ بارہ تیرہ برس کی عمر تک
میں نے اسے بارہا دیکھا تھا، ستایا تھا، چھیڑا تھا —— جب بھی مامی جان
کے ہاں جانا سب سے آگے وہ مجھے ملتی تھی۔ مگر پانچ سال سے ماں جی'
نے مجھ سے اس کا پردہ کرا دیا تھا۔ منگیتر تھا نا۔

چودھویں کا ایک گول چمکدار چاند، لیمپ کی دھیمی روشنی میں دمک رہا
تھا —— مگر اس چاند کی ناک میں ایک بڑی سی نتھ تھی اور سونے کے
جھومر کے بہت سے ننھے ننھے چاند کالے بالوں سے نیچے اس کے روشن
ماتھے کے آدھے چاند پر ہلکورے لے رہے تھے!

"مہ رخ —— تم سچ مچ چاند ہو۔ مگر بے نور ——"
میں نے بات کی ابتدا عجب بے ڈھنگے انداز میں کی۔

"بے —— بے نور ——" گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سیاہ،
ذہین، شرمیلی آنکھوں کے گرد گھنی سیاہ پلکوں کا گھیرا تھا۔

"اب بے نور نہیں —— ان آنکھوں کی روشنی نے چاند کو منور کر دیا"
اس نے شرما کر آنکھیں جھکائیں تو لمبی لمبی پلکیں اس کے سرخ رخساروں
کو چھو رہی تھیں!

"مہ رو"

"سیاں"

ایک پیار میں ڈوبی آواز آئی اور جانے کون سی مقناطیسی کشش تھی۔
میں کھنچتا چلا گیا۔

سارے منصوبے دھرے رہ گئے!
نسیم ہار گئی!
میں ہار گیا! ماں جی جیت گئیں۔

(۳)

ورق پر لکھے لفظ ختم ہو گئے مگر زندگی کے ان ابتدائی دنوں کی یاد ذہن میں روشن سے روشن تر ہوتی جا رہی تھی جب وہ اور مہرو ——— مہرو اور وہ مسرت کی، محبت کی گھڑیاں بتا رہے تھے ——— وہ مسرت جو زندگی میں صرف ایک بار ——— صرف ایک بار ملتی ہے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ محبت یہ ہے جو اب مہرو سے کر رہا تھا ——— یا وہ تھی جو اسے نسیم سے تھی۔ یا یہ ہے ——— اس میں شعلوں کی وہ لپک نہیں۔ جذبات کا وہ وفور نہیں۔ ناز و غمزہ و ادا کا وہ انداز نہیں، حُسن کا وہ سنہری جال نہیں جس نے اسے جکڑ رکھا تھا ——— یہ تو ایک دھیمی نرم لطیف روشنی تھی جو اس کی قربت میں اس کے گرد ہالہ کر لیتی تھی۔ الفت کی وہ کشش تھی جو بے اختیار ایک دوسرے کی طرف کھینچتی ہے ——— سکون و راحت کا ایک احساس تھا جس کا کوئی نام نہیں ——— جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔۔ دو دلوں کی ایک دھڑکن تھی جو ایک نرالی خوشی بخشتی تھی۔ ان کے منہ سے

نکلا "سیاں" کا لفظ، کانوں میں جیسے شہد گھول رہا ہو۔ "سیاں۔ سیاں" شرمیلا اور بے ساختہ محبت کا نرالا انداز۔ جانے کہاں سے اس نے یہ پیارا اندازِ تخاطب سیکھا تھا۔ اس نے کئی بار چھیڑا پوچھا مگر وہ مسکرا کر شرما کر رہ جاتی۔ بہت اصرار پر ایک بار بس اتنا کہا "تو کیا تم میرے سیاں نہیں ہو ـــــ" اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی، بھرے بھرے مسی لگے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی ـــــ "سیاں تو تم میرے ہی ہو۔ عاشق چاہے کسی کے بھی ہو ں گے

وہ کچھ جواب نہ دے سکا ـــــ خاموشی سے اس کا منھ دیکھتا رہا اور سوچتا رہا تھا مہرو کو کہاں تک معلوم ہے میرا اور نسیم کا قصہ؟ وہ کوئی بہانہ بنا کر باہر چلا گیا ـــــ دن بھر گھر میں نہ آیا ـــــ اپنے سب سے پیارے دوست اختر علی کے گھر چلا گیا۔ اس نے بہت چھیڑا، مذاق اڑایا، سنایا، بے وفائی کے طعنے دیے ـــــ اور پھر مہرُخ سے اس کی وابستگی پر سچے دل سے اظہار مسرت کیا! دوسرے دوستوں کو بھی خبر مل گئی۔ سب جمع ہو گئے شام تک تاش کی بازی جمی رہی۔ پھر سب نے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا ـــــ ان کے قصبے میں ایک ہی تو سینما ہاؤس تھا اس زمانے کی بڑی زوردار پکچر "طوفان میل" لگی ہوئی تھی۔ فلم کے بعد سب نے مل کر ایک دوکان میں کھانا کھایا اور واپسی پر اختر نے زبردستی اسے اس کے گھر پر اتار دیا "سہیل اب تم گھر جاؤ ـــــ بھابی کی گالیاں چپ چاپ کھا لینا اور ماں جی کی جوتیاں بھی۔ قصور تو ہوا ہے ـــــ خیر وہ دوست کیا جو دوست کے کام نہ آئے ـــــ کل آ کر ماں جی سے کہہ دوں گا کہ سہیل میرے پاس تھا مجھے بخار چڑھ آیا تھا۔" اس نے ایک آنکھ دبائی۔ تانگہ آگے بڑھ گیا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ بارہ بجنے والے تھے!

وہ دبے پاؤں بیٹھک میں گیا ـــــ اللہ بخش سو رہا تھا۔ بچارا میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ انتظار ـــــ انتظار تو مہرو بھی کر رہی ہو گی ـــــ ماں جی

بھی شاید جاگ رہی ہوں - اب کون اندر جائے. نیند آرہی ہے —— جانے روٹھی بیوی کو منانے میں کتنا وقت لگ جائے —— یار چلو یہیں سوئے جاتے ہیں! اور صوفے پر پڑتے ہی اسے گہری نیند آگئی - جوانی اور بے فکری کی نیند!

خاصا دن چڑھ آیا تھا —— کوئی اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ "بڑی بھابی" اس نے آنکھیں کھولیں۔

"جی ہاں! بڑی بھابی —— آخر یہ کیسی نیند ہے۔ اب اٹھوگے یا میں پانی کا گھڑا انڈیلوں۔"

وہ گڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"آپ؟ آپ صبح صبح کیسے آگئیں؟"

"تمہارے کان کھینچنے کے لیے۔"

"سمجھ گیا ماں جی نے بلایا ہے"

"تو کیا میں بے بلائے نہیں آسکتی؟ میں تو کل صبح سے آئی ہوں" وہ چپ رہا۔ کہاں غائب تھے؟"

"بڑی بھابی! میں کوئی قیدی ہوں؟ آخر میرے دوست احباب ہیں. میری پڑھائی ہے۔ امتحان دینا ہے۔ دن رات اگر میں آپ کی چہیتی دیورانی کی گود میں سر رکھے پڑا رہوں گا تو پھر —— پھر آپ ہی سوچیے؟" وہ ایک دم بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ بھابی سے وہ بے تکلف ضرور تھا مگر ان کی عزت بھی بہت کرتا تھا۔ ان سے یہ بے باکی؟ ہاں اس زمانے میں یہ "بے باکی" ہی تھی!

"ہاں بھیا میں جانتی ہوں۔ مگر چچی اماں اور بہو کا دل دکھا کر کچھ نہ کہو —— دن بھر تو خیر، مگر یہ رات کو غائب رہنا؟" "مگر میں تو بارہ بجے آکر یہاں سو گیا تھا بھابی"

"مگر گھر میں کسی کو کیا خبر ۔ تم کہہ کر جاتے ۔ سمجھا کر جاتے جانتے ہو تمہاری مہرو نے رو رو کر آنکھیں سُجا لی ہیں —— رات سے کچھ کھایا بھی نہیں —— اور ماں جی —— خیر وہ تو پیدا ہی دکھ اٹھانے کو ہوئی ہیں ——" اور وہ تنتناتی اندر چلی گئیں ۔

پہلی بار روٹھی بیوی کو کیسے منایا جائے گا ؟ اس سے پہلے تو وہ ہی دو ایک بار روٹھ گیا تھا اور مہرو نے اسے منا لیا تھا ۔ شبنم کو شعلہ بنتے اس نے اسی دن دیکھا تھا ۔ اسی دن جانا تھا کہ مہرو خوش مزاج ہی نہیں بڑی تیز مزاج بھی ہے —— خیر بد زبانی یا بدتمیزی تو نہیں کی مگر طنز کے نشتر خوب چلائے اور پھر خود ہی منہ پھلا لیا اور آنسوؤں کی بارش شروع ہو گئی ! اس کا کوئی عذر کوئی بہانا سننے پر تیار ہی نہ تھی ۔

" میں کیا جانتی نہیں کہ میں آپ کو پسند نہ تھی ۔ آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہی نہیں تھے ۔ یہ پھوپی اماں کی زبردستی تھی ۔ میں آپ کی بیوی ہوں صرف بیوی ۔ محبوبہ کوئی اور ہی ہے ——" اور پھر وہی آنسوؤں کا منہ !

اس کی چاپلوسی ، دلداری ، پیار و محبت کا اظہار سب بے کار جا رہا تھا ۔ بار بار اس کا ہاتھ جھٹک دیا جاتا ۔ " وہیں جائیے جہاں کل رات اور دن بھر گزار کر آئے ہیں ! "

اس کی ہمیشہ دلداری ہی ہوئی تھی ۔ ماں جی کی تو وہ زندگی تھا ۔ ابا جان اور امی جانی بھی اس کی دلداری کرتے تھے ۔ نسیم جان دیتی تھی چھوٹے بھیا اور بڑے بھیا بھی چاہتے تھے ۔ اب مہرو اتنی محبت کرتی تھی —— لیکن یہ غصہ یہ خفگی ۔ وہ اس کا عادی کہاں تھا ۔ ایک دم غصے میں بھر گیا ۔

" مہرو تم اتنی بدگمان ہو —— اچھا تو میں چلا جاتا ہوں ——"

" کہاں " بے اختیار وہ چلائی

" وہیں جہاں رات بھر رہا ——"

"ہائے آپ مجھے چھوڑ کر اس کے پاس——" اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ منھ سرخ ہو گیا۔ یا اللہ ماں جی کی طرح یہ بھی اختلاج کی مریض تو نہیں؟" مہرو"
اس نے تحکم سے کہا —— "بات سنو۔ اور یہ ہسٹریا —— اس سے مجھے نفرت ہے —— " مہرو نے ڈر کر اسے دیکھا۔

"میں کل دن بھر اختر علی اپنے دوست کے ہاں رہا —— اسے تیز بخار چڑھا تھا —— دوستی کا بھی دنیا میں کوئی رشتہ، کوئی حق ہے آخر؟ آدھی رات اسے سکون ہوا تو گھر بھاگا۔ اندر کا دروازہ بند تھا —— ماں جی کے ڈر سے باہر ہی بیٹھک میں پڑ گیا ——"

مگر جھوٹ بولتے ہوئے اس کا دل کانپ رہا تھا۔

"سچ کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں"

"کھائیے میرے سر کی قسم!"

"تیری قسم مہرو" اور دل میں کہا "تیری قسم میں اختر کے ہاں تھا——"

"کھانا کھایا تھا؟"

"کہاں کھایا —— کل دوپہر سے بھوکا ہوں ——"

"ہائے سیاں تم بھوکے ہو ——" اس کا فطری انداز لوٹ آیا اب وہ "آپ" نہ تھا "تم" تھا —— "سیاں" تھا —— اس کا اپنا "سیاں" وہ لپک کر اٹھی اور باہر نکل گئی "میں ابھی ناشتہ لاتی ہوں ——" وہ ابھی تک ماں جی سے گھونگھٹ کرتی تھی۔ اور سب سے تو گھونگھٹ اور بھی لمبا تھا۔ مگر کام کرنے کی عادت سے مجبور تھی۔ جانے کیسے اس لمبے گھونگھٹ اور بھاری کام کے غراروں میں وہ کام کر سکتی؟

دوپٹے کو ماتھے پہ سرکاتی وہ صحن میں سے ہو کر باورچی خانہ میں جا رہی تھی۔ اس کا دل ملامت کر رہا تھا۔ اس نے جھوٹی قسم کیوں کھائی اسے

کچھ ہو جائے تو — نہیں نہیں — خدا معاف کرے گا — مگر شرم آنی چاہیے — وہ رات سے بھوکی ہے اور اس کی جھوٹ موٹ کی بھوک سنتے ہی تڑپ گئی — اور تم — بے مجبت — بہانہ باز — جھوٹے — ارے — یہ مہرو کے دل کی آواز اس کے سینے سے کیوں نکل رہی ہے؟

تھوڑی دیر بعد پیرا اٹھے، قورمہ کا سالن اور انڈے کی ٹکیاں سینی میں سجائے وہ چلی آرہی تھی۔ غرارہ زمین پر لوٹ رہا تھا۔ گھونگھٹ دھوبنوں کی طرح الٹ رکھا تھا — اس نے لپک کر سینی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ دونوں نے اصرار کر کے، اپنی قسمیں دے دے کر ایک دوسرے کو کھانا کھلایا، چائے پلائی۔ اس نے نوالے بنا بنا کر بیوی کے منھ میں دیے۔ وہ اٹھلائی، مسکرائی مگر انکار نہیں کیا۔ ان دونوں کے دبے دبے قہقہے شاید شہ نشین سے باہر نکل گئے تھے۔ بڑی بھابی نے پردہ اٹھایا، ایک قدم رکھا اور پھر باہر بھاگ گئیں۔ وہ سہم گئی۔ وہ خود ہنسنے لگا۔

"اب کیا ہوگا؟"

"ہوگا کیا میاں بیوی کا ہنسنا بولنا گناہ ہے کیا؟"

"مگر پھوپھی اماں؟" وہ سہمی ہوئی آہستہ بول رہی تھی!

"ہنھ — اماں تو بس —" یکایک اسی کی نظر اٹھی۔ پردے کی جھری میں سے ماں جی کا آدھا چہرہ نظر آرہا تھا اور منھ پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور ممتا کا نور!

اس کا ہاتھ مہرو کے منھ کے سامنے رکا رہ گیا۔

"کیا ہوا؟"

"ماں جی دیکھ رہی تھیں —"

"ہائے سچ —"

"ڈرتی کیوں ہو میری جان —"

"ہٹو ـــــ تم بھی بس ـــــ!"

اور اس فرسودہ مصرع کے نئے معنی، نئے مطالب اس پر آج روشن ہوئے سے

بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

....

جانے کب اس کی آنکھ جھپک گئی۔ بکھرے، الجھے پریشان خواب! ایک پرندہ دور سے اڑتا ہوا آ رہا ہے ..... اس کے سر کے اوپر آ کر چکر کھاتا ہے، وہ ڈر رہا ہے، چیخ رہا ہے اور پھر وہ اس کی گود میں گر جاتا ہے ـــــ مگر وہ پرندہ کہاں ـــــ وہ تو شاہین ہے! ابا میاں ـــــ اماں ـــــ اماں جانی ـــــ افق کے اس پار کوئی بال کھولے دونوں ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے آجا ـــــ آجا ـــــ جا ـــــ لال ـــــ ماں جی۔ ماں جی ـــــ ہیں ـــــ ہیں ـــــ مجھے گود میں لے لو ماں جی ـــــ نہیں ـــــ نہیں یہ ماں جی نہیں ـــــ یہ تو کوئی ڈائن ہے ـــــ منہ کھولے، دانت نکالے ـــــ اس کو نوچ رہی ہے ـــــ نہیں نہیں دلہن امی ـــــ مجھے ـــــ مجھے ـــــ نہ گھسیٹو ـــــ ہیں میں نہیں جاؤں گا ـــــ قہقہہ، قہقہہ ـــــ یہ کس کے قہقہے ہیں ـــــ یہ کون اس سے لپٹا کھڑا ہنس رہا ہے ـــــ باہوں میں جکڑ لیا ہے ـــــ نہیں ـــــ نہیں چھوڑوں گی ـــــ نسیم ـــــ نسیم ـــــ چھوڑو ـــــ چھوڑو مجھے ...... "مہرو ـــــ مہرو ـــــ بچاؤ ـــــ بچاؤ ـــــ"

ایک گھٹی ہوئی آواز اس کے گلے سے نکلی آنکھ کھل گئی ہے۔ اس سخت جاڑے میں ان کی ساری جان پسینے میں نہائی ہوئی ہے ...... وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہے ہیں..... صبح کی ملگجی، دھندلی، بے رنگ روشنی کھڑکی کے شیشوں میں سے چھن چھن کر کمرے میں طرح طرح کے سائے پیدا کر رہی ہے۔ ان کی دھندلی آنکھیں اور بھی دھندلی ہو جاتی ہیں۔ "مہرو ـــــ میری چائے ـــــ"

(۵)

ایک کراہ کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ چائے کی شدید خواہش محسوس ہو رہی تھی ——— "آج ——— مہرو ——— چائے نہیں لائی" دل میں خیال آیا۔ گزشتہ سال بھر سے ان کی حال کی یادداشت بہت کمزور اور ماضی کی بہت تیز ہوتی جا رہی تھی۔ لعض وقت وہ گھبرا جاتے ——— کیا ہوتا جا رہا ہے ان کو؟ کہیں دماغ پر تو اثر نہیں ہو رہا ہے؟ مہرو اکثر انھیں ٹوک دیتی "کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو تم لعض وقت میں کیا پوچھ رہی ہوں اور تم اور ان کی تو ران بک رہے ہو ——— " عمر کے ساتھ ساتھ ان میں بے تکلفی اور زیادہ ہو گئی تھی۔

"پھوپھا ابا ——— پھوپا ابا ——— " کوئی ان پر جھکا ہوا کہہ رہا تھا ——— صورت صاف نظر نہیں آ رہی ——— کون ہے یہ ——— "کون؟" "میں ہوں پھوپا ابا ——— عالیہ" اور پھر وہ اس سے لپٹ کر چیخ چیخ کر رونے لگی!

ان کا دماغ کام کرنے لگا ——— اچھا تو یہ پہلا ماتم دار آیا ہے؟ مہرو کا ماتم دار ——— غم منانے کے لیے ——— غم ——— غم؟؟ مگر رکھائی ان کی

فطرت کے خلاف تھی اور صاف گوئی سے بچتے رہتے تھے۔ یہ تو وہ تھی جو اس
صاف گوئی کی وجہ سے بدنام تھی ۔

"ہائے پھوپا ابا یہ کیا ہوا ــــ ہائے میری پھوپی اماں ــــ کتنا چاہتی
تھیں وہ مجھے ــــ کتنا پیار کرتی تھیں۔ اب کون ہے چاہنے والا ــــ
اماں اور ابا کے بعد انھیں کا دم تو رہ گیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ہائے پھوپا ابا ــ
آپ کا یہ حال ہو گیا ــــ"

انھوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے گلے سے لگا لیا "صبر کرو بیٹی ــــ"
عالیہ باجی ہمت سے کام لیجیے ــــ آپ اتنی بے قرار ہوں گی تو ــــ ذرا چچا جان
کی حالت دیکھیے ــــ" نازش کی آواز ان کے کان سے ٹکرائی ۔

کسی نے روشنی جلا دی تھی ۔ نازش تھکا ہارا ــــ ساری رات
کے جاگنے کا خمار آنکھوں میں، چہرہ پریشان اور اترا ہوا اس کے پاس کھڑا تھا۔

"آ گئے ..... بیٹا ــــ"

"جی ہاں چچا جان ۔ ابھی آیا ہوں!"

اس نے ہاتھ پکڑ کر ان کو اٹھایا اور باہر برامدے میں سے ہو کر
بیٹھک کی طرف چلا ۔

بیٹا ــــ میں ــــ ذرا ــــ اُدھر ــــ" ان کی آواز کانپ رہی تھی

"عالیہ باجی آپ اس کمرے میں جائیے ۔ تلاوت کیجیے ۔ میں چچا جان کو
لے کر ابھی آتا ہوں۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے عالیہ کو اس کمرے میں بھیجا جہاں
اس کی "پیاری پھوپی اماں" تھیں اور خود ان کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھک میں آ گیا۔

اختر علی نے صبح کی پھٹتی پو کی روشنی میں اپنے عزیز ترین دوست
کی طرف دیکھا ...... سر کے بال جو اب بھی خاصے گھنے اور لمبے تھے اور بالکل
سفید، بکھرے الجھے ہوئے ماتھے اور گردن پر پڑے تھے ــــ آنکھوں کے

گرد کی لاتعداد جھریاں گہری ہو گئی تھیں اور چوڑے ماتھے پر پڑی سلوٹیں۔ ان کی گنتی شاید اور بڑھ گئی تھی۔ اور جس کمر کو پچھتر سال کا سرد و گرم نہ جھکا سکا تھا ـــــ وہ ایک رات میں خم ہو گئی تھی۔ جن ہاتھوں میں کل تک زرا بھی رعشہ نہ تھا ـــــ وہ کانپ رہے تھے ـــــ ایک رات میں اچھے خاصے سہیل میاں بوڑھے پھونس ہو گئے تھے!

"سہیل ......" بمشکل وہ اتنا کہہ سکے اور ان کا بھاری بھرکم جسم لرز گیا ـــــ

"ہاں بھائی!"

"زرا میرے گھر تک چلو ......"

"نہیں اختر ...... نہیں ...... ابھی تو وہ ـــــ ابھی تو مہرو ـــــ"

وہ جملہ پورا نہ کر سکے۔ آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ انھوں نے سہیل میاں کا ہاتھ پکڑا اور جیسے دو سال کے بچے کو لے جاتے ہیں ان کو لے چلے ......

"نازش بیٹا تم یہیں ٹھہرو۔"

ڈپٹی اختر علی نے اپنا گھر نئی وضع کا بنوالیا تھا۔ بڑے بڑے آراستہ کمرے تھے۔ ان سے ملحق باتھ روم۔ فلش کے پاخانے اور ٹھنڈے گرم پانی کا انتظام۔

"بھیا زرا منھ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل ڈالو ـــــ نماز پڑھ لو ـــــ ابھی دن بھر تلاوت کرنی ہے ......" انھوں نے دوست کی توجہ ان کے کپڑوں کی طرف دلائی جو اتنے میلے گندے ہو رہے تھے کہ وہ خود بھی حیران سے رہ گئے۔ شاید چار پانچ دن سے انھوں نے کپڑے نہیں بدلے تھے۔

"نہانا نہیں ـــــ کپڑے باتھ روم میں رکھے ہیں ـــــ دروازہ بند نہ کرنا ـــــ میں یہاں ہی بیٹھا ہوں ـــــ"

ایک تلخ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر ابھری "تم پریشان نہ ہو

اختر — مجھے بھلا کیا ہو گا — ایسا غیرت دار کہاں ہوں ......"

اختر علی نے جانماز بچھا رکھی تھی۔ وہ کپڑے بدل کر آئے تو ان کو نماز پڑھوائی اور پھر نوکر کو اشارہ کیا وہ کشتی لے کر آ گیا!

"نہیں اختر — کچھ کھایا نہیں جائے گا —"

"ایک پیالی چائے پی لو دوست — سر چکرا رہا ہے"

چائے کے ساتھ وہ آنسوؤں کے گھونٹ بھی اتارتے رہے۔

"جب میں کھانا نہیں کھاتا — تو وہ — وہ مجھے اپنی جان کی قسم دے کر کھلایا کرتی تھی!" پیالی ان کے ہاتھ میں لرز رہی تھی۔ اختر علی نے پیالی تھام لی اور ایک بسکٹ اٹھا کر ان کے منھ کے آگے کیا "تمھیں بھابی کی قسم یہ بسکٹ کھا لو بھیا — ورنہ وہ بے چین ہوں گی — ان کی ...."

روح کا لفظ اختر علی کے منھ سے نہ نکل سکا۔

سہیل میاں نے ان کے اصرار پر وہ بسکٹ کھا لیا۔ بڑھاپے میں بھوک کی برداشت یوں بھی کہاں ہوتی ہے اور آج وہ چوبیس گھنٹے سے بھوکے پیاسے تھے — حالانکہ کبھی غصے میں بھی وہ کھانا نہ چھوڑ سکتے تھے۔ جیسے ہی مہرو نے کہا "میری جان کی قسم تھوڑا سا کھا لو" اور وہ ڈٹ گئے کھانا کھانے۔

اور اب — اب کل دوپہر — نہیں اختر علی ہی نے تو انھیں اپنے ہاں بلا کر کھانا کھلایا تھا۔ اس لیے کہ مہرو کی بیماری کے بعد سے انھیں کھانے پینے، کہیں کا ہوش نہ تھا۔ سلیمہ بھابی گٹھیا کی مریض ہیں۔ مگر نازش جیسا سعادت مند بیٹا ہے۔ باہر کے ملک میں دس ہزار کی نوکری مل رہی تھی مگر ٹھکرا دی! "یہاں ماں اور بابا اکیلے رہ جائیں" جو بھی تنخواہ ملتی ہے اس میں آدھی سے زیادہ ماں کو دے دیتا ہے۔ بیوی بھی نوکری کرتی ہے اور دونوں، جب ضرورت ہو چھٹی لے کر ماں باپ کی خدمت کے لیے آ جاتے ہیں۔ دو دو نوکرانیاں ماں کی خدمت کے لیے رکھی ہیں .... خود اختر علی

ی ٹینشن ہے، جانبداری بھی ہے ـــــ بڑھاپا چین سے کٹ رہا ہے۔ بیماری آزاری کسے نہیں ہوتی مگر یہ دکھ ـــــ یہ کرب تو نہیں ـــــ جو انھیں ہے ـــــ

پھر وہ اک دم چونک پڑے ـــــ وہ یہاں بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ اور مہرو وہاں اکیلی ہے!

وہ کھڑے ہو گئے۔

"ذرا دیر سو جاؤ سہیل۔ پھر چلے جانا"

"نہیں اختر ـــــ وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی" وہ متوالے شرابی کی طرح لڑکھڑا رہے تھے ـــــ اندر سے سلیمہ بیگم کے رونے کی آواز آنے لگی۔ اختر علی سہیل میاں کو سنبھال کر ان کے گھر کی طرف لے چلے۔

....

محلے پڑوس کی عورتیں کمرے کے اندر قرآن خوانی کر رہی تھیں! پڑوس کی مسجد سے کلام پاک کے تیس پارے نظیرا جاکر لے آیا تھا۔ رحیمن ہر آنے والی کو ایک پارہ دے دیتی تھی اور پھر خود پائینتی بیٹھ کر یٰسین شریف حفظ پڑھنے لگتی تھی۔ قرآن پڑھ نہیں سکتی تھی۔

عالیہ کے رونے اور بین کرنے کی آواز باہر تک آرہی تھی۔ "ذرا دیر یہاں بیٹھ جاؤ" اختر علی نے بیٹھک میں ان کو پرانی گدے دار کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ ایک دم چونکے۔

"نازش میاں کہاں ہیں؟"

"میں یہ ہوں چچا جان ـــــ عالیہ باجی میرے ساتھ چلی آئی ہیں ـــــ" وہ کچھ رکا ـــــ "خورشید آپا کے گھر پرچہ بھجوا دیا ہے.........
اور..... "

"اور کیا ہوا؟" اب کے اختر علی نے سوال کیا۔ اس نے آکر سہیل میاں

کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میں نے تنویر بھائی کو حیدر آباد میں فون کر دیا ہے ــــــ بڑی مشکل سے مل سکا۔۔۔۔"

"ہوں۔۔۔۔۔۔" بس وہ اتنا ہی کہہ سکے۔

"غزالی کو لندن میں فون کرنے میں کئی گھنٹے لگ گئے۔۔۔۔"

"پھر ــــــ ملا وہ نالائق؟" سہیل میاں کا لہجہ کانپ رہا تھا۔

"جی ــــــ" مجرم کی طرح نازش نے کہا۔

"کیا کہا غزالی نے؟" پھر اختر علی ہی نے پوچھا!

"اس نے کہا۔۔۔۔۔ اس نے کہا ــــــ وہ کوشش کرے گا، شاید وقت پر پہنچ جائے۔۔۔۔"

"وقت پر ــــــ وقت پر ــــــ" سہیل میاں غصے میں غرائے ــ "اسی وقت کا منتظر تھا وہ؟"

"پاکستان فون نہ ہو سکا۔ میں نے ارجنٹ تار دیا ہے۔۔۔۔"

"فضول ــــــ بےکار۔۔۔۔۔ کوئی نہیں آئے گا ــــــ ہرگز نہیں!"

"نہیں، چچا جان تنویر بھائی تو آج ہی روانہ ہو رہے ہیں!" "اور مجھے یقین ہے شاہین بھی ضرور آئے گی ــــــ ویزا مل جائے گا ــــــ اس کے میاں کا بہت رسوخ ہے۔" اختر نے کہا۔

"کیوں آئیں گے؟ کس سے ملنے؟"

"تم بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو یار۔ آخر وہ ان کی ماں ہیں"

"ماں؟ کس کی ماں؟ وہ جس کو برسوں سے الٹ کر نہیں پوچھا، وہی ماں؟" آواز تھی کہ ٹوٹے ساز کا شر۔ نازش نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا "چچا جان۔۔۔۔۔ تنویر بھائی نے کہا ہے ان کا انتظار کیا جائے۔ ان سب کا ــــــ وہ آخری دیدار تو کر لیں ــــــ"

"ہاں آخری دیدار ضرور کر لیں ــــــ پھر کبھی ستانے نہیں آئے گی۔"

"سہیل بھیا ــــــ"

"تم چپ رہو اختر ــــــ میں ابھی دفن کفن کا انتظام کراتا ہوں۔ میں ــــــ میں ان کو اس کی جھلک بھی نہ دکھاؤں گا بڑی ماں والے ــــــ"

اختر علی نے کبھی انھیں اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ نازش نے گھبرا کر باپ کو دیکھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی!

"سہیل ــــــ سب کی اپنی اپنی جگہ ہوتی ہے ــــــ بچے لاکھ نالایق ہوں ــــــ ماں کی محبت دل سے نہیں نکال سکتے! پھر تم ــــــ جو اتنے صابر ہو ــــــ معاف کرتے رہے ہو ــــــ شکوہ تو بھابی کرتی تھیں ــــــ تم تو سمجھایا کرتے تھے ان کو...... طرف داری کرتے تھے سب کی ــــــ"

"آہ ــــــ یہی غم تو ہے ــــــ میں اس کا دکھ جانتے ہوئے بھی اس کو سمجھاتا تھا ــــــ الزام دیتا تھا ــــــ کہتا تھا دنیا کا یہی رنگ ہے ــــــ سب یہی کرتے ہیں!"

"ٹھیک ہی تو کہتے تھے ــــــ"

"نہیں جھوٹ بولتا تھا ــــــ اسی دنیا میں نازش اور ثریا جیسے نوجوان بھی ہیں ــــــ اسی ملک میں مسرا بھائی کی بیٹی بھی ہے۔ اسی دور میں سعادت مند چاہنے والی اولادیں بھی ہیں جو خدمت کرتی ہیں۔ خیال کرتی ہیں ــــــ ماں باپ کو ستاتی نہیں ــــــ ذلیل نہیں کرتیں....."

"سہیل ــــــ سہیل بھیا!"

"چچا جان ــــــ میرے چچا جان ــــــ"

"نہیں اب میں ان کی انسلٹ برداشت نہیں کر سکتا ــــــ اور غزالی کو تو ان کا منہ تک نہیں دکھاؤں گا ــــــ" ان کا چہرہ سرخ

ہو گیا تھا ــــــ اختر علی نے ان کو آہستہ سے صوفے پر لٹا دیا اور کمبل اوڑھا دیا ــــ "اچھا ــــ اچھا ــــ تم ذرا دیر سکون سے لیٹ جاؤ ــــ"

....

نازش کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اسے لندن کا قصہ یاد آ رہا تھا جو اس کے سامنے ہوا تھا

غزالی ــــــ اس کا بچپن کا دوست۔ چچی کا سب سے لاڈلا بیٹا۔ ماں باپ سے ضد کر کے لندن چلا گیا تھا۔ چار سال کا کہہ کر گیا اور اب گیارہ برس ہو گئے واپس نہیں آیا۔ چچی خط پر خط لکھتیں۔ آ کر شادی تو کر لے۔ پھر چلا جائیو ــــــ مگر وہ ٹال جاتا۔ اس کے محکمہ کی طرف سے دو تین مہینے کے لیے اسے یورپ بھیجا گیا تھا۔ پہلی منزل لندن تھی۔ اس نے غزالی کو لکھا تو وہ اسے لینے کے لیے آیا ــــــ غزالی نے بتایا کہ ابا اور اماں بھی آئے ہوئے ہیں۔ وہ شادی کرنا چاہتا ہے اور وہ سوچتا ہے اماں کے سامنے ہی کر لے۔ ان کی حسرت بھی پوری ہو جائے۔ پھر اس نے لڑکی کے بارے میں کچھ بتایا ــــــ نازش سوچ میں پڑ گیا۔ چچی شاید ہی راضی ہوں!

دو تین دن بعد وہ غزالی کے گھر پہنچا۔ چھوٹے سے آراستہ پیراستہ فلیٹ میں بس تین کمرے تھے۔ ایک بڑا بیڈ روم غزالی کا تھا۔ ایک چھوٹا سا سٹنگ روم اور کھانے کا کمرہ تھا اور اس سے ملحق ایک چھوٹا سا اور کمرہ۔ اس میں چچا اور چچی کے پتلے پتلے پلنگ۔ بچھ کر چلنے پھرنے کی بھی جگہ نہیں بچتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ چچی ایک بار تنویر بھائی کے پاس بھی جا چکی ہیں مگر اس بار ان کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ نائی لون کی آسمانی ساڑھی۔ جوڑے میں پھول لگائے۔ چست بلاؤس پر نیلا کارڈگن اور نیلی شال، کتنی اسمارٹ لگ رہی تھیں۔ چچا نے بھی اپنی ڈپٹی کلکٹری کے زمانے کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ دونوں ابھی ابھی بازار سے شاپنگ کر کے واپس آئے تھے۔ یہاں آ کر بھی چچی نے اپنی عادت

نہیں چھوڑی تھی۔ گھر کا سارا کام سنبھال لیا تھا۔

غزالی نے اس سے کہا تھا کہ وہ اماں کو اس کی شادی کے بارے میں بتادے اس سے پہلے اس نے شادی کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا وہ "فری محبت" کا قائل تھا۔ مگر یہ لڑکی؟ کیسے چچی اور چچا سے کہے؟ وہ ٹھہرے پرانے خیالات کے! پہلی ملاقات میں تو بس اس نے اتنا ہی کہا "مبارک ہو چچی جان۔۔۔۔ وہ آپ کا ناکارہ بیٹا اب بیاہ پر راضی ہے!" ان کا چہرہ مسرت سے کھل گیا اور جھٹ جٹ ہوا میں ہاتھ ہلا کر بلائیں لے کر بولیں "قربان اس کی قدرت کے! کیسے امید تھی کہ غزالی راہ پر آجائے گا۔۔۔۔" اور پھر سوالوں کی بوچھار کر دی۔ کون ہے؟ کہاں کی ہے۔ ماں باپ کہاں ہیں؟ کیسی ہے وغیرہ وغیرہ!

"ہنہ تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے۔ اے غزالی کو پسند ہے یہ کیا کم ہے۔"

اس نے ٹالا۔۔۔۔ "یہ سب تو میں جانتا نہیں چچی جان۔ ہاں یہ کہتا تھا پاکستانی لڑکی ہے۔۔۔۔"

"ارے یہ تو اور بھی اچھا ہے! مسلمان تو ہوگی ہی۔ پھر پاکستان واکستان کیا سب اپنے ہندوستانی ہی ہیں۔۔۔۔ غزالی سے کہو مجھے اس کے گھر والوں سے ملوا دے۔۔۔۔"

اس نے دبی زبان سے کہا "خدا جانے اس کے گھر والے یہاں ہیں بھی یا نہیں۔۔۔۔"

"اے ہوں گے کیوں نہیں۔ ارے اب تو یہاں اپنے بہت سے لوگ بسے ہیں۔ خوب محفلیں ہوں ہیں۔ میلاد کی۔ مجلس کی۔ بیاہ شادی بھی اپنے ہندوستانی ڈھنگ سے کریں ہیں لوگ۔ ساری رسمیں۔ ابھی اس دن چودھری شمیم الدین کے ہاں گئی تھی۔ لڑکی کا بیاہ تھا۔۔۔۔ واہ وا۔۔۔۔ بالکل اپنے ہاں کی طرح دلہن بنی بیٹھی تھی۔ کیسی پیاری لگ رہی تھی۔"

وہ ہندوستان پاکستان کو ہمیشہ ملا دیتی تھیں۔

"غزالی سے کہیے گا۔ کسی دن لڑکی کو دکھا دے گا"

"اوئی بیٹا ——— یہاں آکر تمہاری بھی مت ماری گئی۔ غزالی لاکر اپنی ہونے والی دلہن کو دکھا دے گا ——— نا بھئی میں اپنی بہو شرم حیا والی پسند کروں ہوں ———"

"بھئی مہرو خدا کے واسطے یہ اپنی ساس کی زبان یہاں لندن میں بیٹھ کر نہ بولو ———" چچا اپنی بیوی کو لاڈ میں مہرو کہا کرتے حالانکہ ان کا نام مہرخ ہے۔

"کیوں نہ بولوں؟ تمہیں بے شرم بہو اچھی لگتی ہوگی ——— مجھے نہیں۔"

"منھ کھولے تو اب تم خود پھرتی ہو ——— دیکھ رہے ہو بیٹے ان کا فیشن خیر سے ساڑھی بھی باندھ گئی ——— سر پر اسکارف بھی بندھا ہے ——— بس ہونٹوں پر لالی اور لگا لیں ———" اور چچا کا قہقہہ چھوٹے سے فلیٹ میں گونج گیا "اور تو اور اب یہ انگلش بھی تو بولنے لگی ہیں۔"

"اچھا بس رہنے دو یہ بے کار کے چونچلے۔ کیا میں جاہل ہوں قدامت پرست ہوں ——— ارے چار چار پڑھے لکھوں کی ماں ہوں۔ ایک بیٹا بزنس مین ——— دوسرا انجینیر ——— اور چھوٹی آرٹسٹ ——— جی ہاں۔" کتنا فخر، کیسی مسرت تھی ان کی آواز میں اور اسی وقت غزالی آگیا بات ادھوری رہ گئی اور سب کھانے پر بیٹھ گئے۔ چچی نے بھنڈی گوشت اور میٹھے ٹکڑے پکائے تھے۔ غزالی مزے لے لے کر کھا رہا تھا "جیو اماں پیاری۔

لونگ لِو مائی ڈیر مدر ———"

"بس بس اترا نہیں ———"

کھانا کھانے کے بعد خازش چلا گیا۔ دو تین دن بعد آیا وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اوپر سے غزالی ایک لڑکی کے ساتھ اتر رہا تھا ——— صورت

گو اچھی تھی مگر لباس ــــ انداز! نیم برہنہ جسم چہرے پر بے تحاشا میک اپ اور آنکھوں میں ایک عجیب تمسخر، نفرت، بغاوت!

بھلا اس لڑکی کو چچی کیسے اپنی بہو بنانے پر راضی ہوں گی؟ وہ ۱۹۴۷ کی قیامت کی یادگار تھی۔ ان بچوں کو جن کا دنیا میں کوئی نہ تھا مختلف اداروں نے کر پال لیا تھا۔ وہ ایک مشنری ادارے کے پلے پڑی تھی۔ اس کے کوئی باپ نہ تھا۔ کوئی ماں نہ تھی۔ کوئی بھائی بہن نہ تھا ــــ کوئی خاندان نہ تھا۔ مگر بدقسمتی سے بہت ذہین اور خوبصورت تھی۔ بی۔ اے تک مشنری اسکول میں پڑھا، پھر وظیفہ مل گیا۔ انگلستان آگئی۔ یہاں غزالی سے ملاقات ہوئی۔ محبت کے پینگ بڑھے اور اب غزالی اس سے بیاہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ نازش کو دیکھ کر وہ رک گیا "ہلو۔ میٹ مائی ڈیر فرینڈ ڈولی ــــ" نازش نے ہاتھ بڑھا دیا "پلیز ٹو میٹ یو" اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ ابھری جیسے تمسخر سے پُر۔ "ہلو ــــ" اور اخلاقاً ہاتھ ملا کر وہ ادپر چلا گیا۔

اندر پہنچا تو چچی اور چچا میں جل رہی تھی۔ چچی کو شبہ ہو گیا تھا کہ یہی لڑکی ہے جس سے غزالی شادی کرنا چاہتا ہے اور وہ بگڑ رہی تھیں اور چچا ان کو چھیڑ رہے تھے، اچھا پھر فیشن والی ہے تو ہوا کرے۔ اس زمانے میں ہمارے قصبے کی لڑکیاں تک ایسے فیشن کرنے لگی ہیں! تم خود اپنے کو دیکھو۔ پردہ چھوڑ دیا، ولایت آتی جاتی ہو، غیر لوگوں سے ملتی ہو ــــ چھری کانٹے سے کھانا کھاتی ہو ......" "اوئی نوج میں تو کبھی نہیں کھاتی۔ یہ مُوا کانٹا میری زبان میں چبھ جاتا ہے۔" چچا یہ سن کر زور سے ہنس پڑے تھے۔ وہ بھی مسکرایا تھا اور پھر اِدھر اُدھر کی بات چھڑ گئی تھی اور اس وقت وہ بہانا بنا کر چلا آیا تھا۔ اگلے دن خاص طور پر چچی نے اسے بلایا تھا کہ میں پلاؤ پکا رہی ہوں۔ تو بھی آ کر کھا لے۔

شام کو وہ پہنچا اسی وقت غزالی بھی گھر میں گھسا۔ چچی ہمیشہ کام کی عادی

کبھی خالی بیٹھنا جانا ہی نہیں ۔ یہاں بھی غزالی کا سارا گھر سنبھال لیا تھا ۔ صفائی کرتیں، بازار سے سامان لاتیں، غزالی کے کمرے کی سجاوٹ، کپڑوں کی دیکھ بھال ۔ اور پھر ہندستانی کھانے پکا پکا کر کھلانا اور کچن کا سارا کام کرتا ـــــ کچن جس میں ان کے بھاری ہوتے جسم کے لیے اچھی طرح چلنا پھرنا بھی آسان نہ تھا ۔ وہ بڑے بڑے کھلے گھروں اور وسیع صحن اور برآمدوں میں رہنے والی ۔ مگر ان کے لیے ڈربہ ہوگا ـــــ ساری جدید آسائشوں اور نئے سامانوں کے باوجود مرغی کا ڈربہ ہی تو تھا یہ گھر!

ڈائننگ ٹیبل پر کھانے کی کئی ڈشیں سجی ہوئی تھیں ۔ پلاؤ اور قورمہ اور کیوڑے کی خوشبو چھوٹے سے فلیٹ میں لبسی ہوئی تھی ۔ "ہلو ممی ڈارلنگ مائی سوئیٹ ممی ۔ آج تو بڑی ڈلی شس چیزیں بنائی ہیں ـــــ"

"چل ہٹ ممی کے بچے ـــــ آیا بڑا انگریز کا باوا بن کے ـــــ"

چچی نے لاڈ بھرے لہجے میں کہا ۔

"پاپا کہاں ہیں؟" غزالی نے پیٹ بجایا "آئی ایم ویری ہنگری!"

"تیرے باوا کچھ پھل لینے گئے ہیں ۔ آتے ہی ہوں گے ۔ تو منھ ہاتھ دھو کر آ ۔ اتنے میں وہ بھی آجائیں گے ـــــ"

"مگر ممی پیاری میں بھوکا ہوں ـــــ سخت بھوکا ـــــ"

"ارے وہ دن بھر تیرا انتظار کرتے ہیں ۔ اتنا کام کرتے ہیں تیرے گھر کا اور تو دس منٹ ان کے لیے نہیں ٹھہر سکتا ـــــ" چچی اپنے بچوں سے بے تکلف تھیں ۔ چچا لیے دیے رہتے تھے ۔ "ممی تم بھی بس ـــــ پاپا آتے ہی ہوں گے ـــــ ہیں ـــــ ارے آؤ نا زش شروع کریں ۔"

"نہیں ـــــ چچا کے آنے کے بعد کھائیں گے ـــــ جاؤ تم بھی ذرا ہاتھ منھ دھو لونا ـــــ چچی کہہ رہی ہیں!"

"ہاں تم لوگ ٹھہرو ۔ میں چپاتیاں پکا کر لاتی ہوں" یہ کہتی ہوئی چچی

کچن میں چلی گئیں۔

"یار ہماری ممی پوری ڈکٹیٹر ہیں —— سچ مچ ان بوڑھے لوگوں کی عقل اس عمر میں کہیں غائب ہو جاتی ہے۔ میں تو عاجز آگیا ہوں!"

"شرم کرو غزالی۔ تم اپنے ماں باپ کے لیے ایسا کہتے ہو!"

"تو کیا جھوٹ ہے؟ ارے ہر بات میں ٹریڈیشن ٹریڈیشن —— ہر چیز ہر کام میں ڈکٹیٹر شپ۔ کیا اختر انکل بھی ......

"بابا؟ ارے ہمارے بابا تو بہت سخت ہیں۔ چچا اور چچی نے تو اپنے کو بہت نئے رنگ میں ڈھال لیا ہے۔ اور تم سب لوگوں کی بات بھی مانتے ہیں۔ میرے بابا اور امی تو —— ان کو دیکھیے تو معلوم ہو حکم چلانا کیا ہوتا ہے ——"

"ہنھ —— نئے رنگ میں ڈھال لیا ہے۔ بالکل غلط۔ وہی زنگ خوردہ ذہنیت جو انڈین لوگوں کی خصوصیت —— وہی سو برس اُدھر کی باتیں...."

"ارے واہ رے یورپین —— اتنے دن میں تم انڈین نہیں رہے؟"

"اوہ —— مگر میری وہ غلامانہ ذہنیت نہیں ہے —— آزادی —— آزادی ہر شخص کا پیدائشی حق ہے ——"

میں نے ہنسی میں بات اڑانی چاہی "یار تو تو اس وقت خوب اردو بول رہا ہے ——"

"بابا آتے رہیں گے —— میں ان کا انتظار نہیں کر سکتا" اور اسی وقت چچا فلیٹ میں داخل ہوئے۔ اگر انھوں نے سنا بھی ہو گا تو ظاہر نہیں کیا "تم آگئے نازش بیٹے کھانا شروع کرو —— میں بھی آرہا ہوں ——" اور وہ کچن میں چلے گئے!

ذرا دیر میں چچی چپاتیاں اور چچا ایک ڈش میں پھل لیے ہوئے کمرے میں آگئے!

"آؤ بھئی —— اب کھانا شروع کرو ——"

کھانا بہت مزے دار تھا۔ سب شوق سے کھا رہے تھے۔ اچانک امی نے پوچھا "غزالی بیٹا — صبح کون لڑکی تھی تیرے ساتھ؟" اس نے تیوری چڑھا کہ ماں کو دیکھا "کون؟ ڈولی تھی"

"ڈولی پالکی میں نہیں جانتی۔ مگر وہ تھی کون۔ تیرے ساتھ کیوں آئی تھی؟"

"اماں بتایا تو تھا کہ میں شادی کرنے والا ہوں؟" غزالی نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

"اس لڑکی سے؟ اس لونڈے نما لڑکی سے جس کا پہننا اوڑھنا بھی ڈھنگ کا نہیں ...."

غزالی نے جواب نہیں دیا۔ چچا نے چچی کو گھورا "ٹھیک تو ہے لڑکی کیا برائی ہے اس میں؟"

"ہاں پاپا بہت ذہین لڑکی ہے۔ بڑی اسمارٹ۔ پھر کتنی پڑھی ہے۔ وظیفہ ملا ہے اسے یہاں آ کر پڑھنے کا۔"

"ہو گی — تیری تو ساری آئی گئی اسمارٹ اور پڑھی ہی ہوں ہیں۔ مگر آخر یہ ہے کون — اس کا مذہب کیا ہے؟" "وہی جو میرا ہے!" غزالی نے بات تو سچ ہی کہی تھی یعنی وہ بھی اس کی طرح لامذہب ہے!

"اور خاندان — ذات — برادری —؟"

"ہنہ اماں — میں ان سب باتوں کو بکواس سمجھتا ہوں!"

"آخر کچھ تو ہو گی؟"

"انسان ہے بس۔ یہ کافی ہے"

"نہ بھئی — یہ میری بہو بننے لائق نہیں ہے۔" چچی کے لہجے میں بڑا اعتماد تھا۔ لاڈ تھا۔ بیٹے پر بھروسا تھا۔ مگر دوراندیشی نہ تھی۔ غزالی کی ضدی طبیعت کو جانتے ہوئے بھی وہ ایسی بات کر رہی ہیں!

"مہرو!"

"اجی تم مت بولو ہم ماں بیٹے کے بیچ میں۔"

"اماں ڈولی ہی میری بیوی بنے گی ——— مائی وائف ———"

اس کا لہجہ تلخ ہوتا جا رہا تھا!

"نہیں وہ میری بہو نہیں بن سکتی۔ نہ آنکھ میں شرم نہ بڑوں کا لحاظ۔ کیسے ہاتھ میں ہاتھ دیے ہوئے تھی۔ بے غیرتی کی حد ہے ——— ننگا پہناوا ———" چچی کو غصہ آنے لگا تھا۔

"وہ جیسی بھی ہے۔ بے شرم، بے حیا ——— کم ذات۔ غریب ——— مگر وہ میری ہے۔ میرے دل کی ملکہ ہے ——— میرے گھر کی رانی ہے۔" غصہ میں وہ ہمیشہ فصیح اردو بولتا تھا۔ "میری شادی اسی سے ہوگی۔"

"بٹیا ——— یہ کیا انداز ہے ماں سے بات کرنے کا؟" چچا کا چہرہ سرخ مگر لہجہ دھیما تھا!

"ماں بھی تو مجھے دو سال کا بچہ سمجھ کر ڈانٹ رہی ہیں۔ میں عاقل و بالغ ہوں۔ میچور ہوں۔ پیسے والا ہوں۔ خود مختار ہوں۔" غزالی کے لہجے میں چھچھورے غرور کا رنگ تھا۔

"میرے لیے تو ——— تو ——— ہمیشہ بچہ رہے گا میرے لعل۔" چچی کی یہی عادت تھی۔ ابھی غصہ ——— ابھی لاڈ پیار۔

"غزالی ——— تمہاری ماں کو میں سمجھا دوں گا۔ تم اس وقت چپ ہو جاؤ"

"نہیں پاپا ——— فیصلہ اسی وقت ہو گا ——— میری شادی ہوگی تو ڈولی سے ہوگی ورنہ نہیں ——— سن لیا اماں تم نے؟"

"تو نہ ہو ——— جیسے اب تک لنڈورا پھرا ہے اب بھی پھر۔ لو"

توبہ کس مصیبت میں پھنس گیا وہ۔ نازش سوچ رہا تھا۔

"شادی میرا پرسنل معاملہ ہے۔ کسی کو اس میں دخل دینے کی ضرورت

نہیں ــــ دیکھ رہے ہیں پاپا آپ اماں کی زیادتی؟" "ارے تم کیوں ضد کر رہی ہو مہرو ــــ بیاہ اسے کرنا ہے۔ ہم کیا یہاں بیٹھے رہیں گے ــــ کرنے دو اسی لڑکی سے شادی۔ جس میں وہ خوش اس میں ہم خوش۔" چچا ہمیشہ سفید جھنڈی دکھانے کے عادی تھے۔

"نہیں ــــ میں نے سنا ہے وہ لاوارث لڑکی ہے۔ اس کے ماں باپ کا......"

"چپ رہو اماں! میں ان بکواس باتوں کو نہیں مانتا....."

"اچھی طرح کان کھول کر سن لے۔ میرے جیتے جی یہ بیاہ نہیں ہوگا" غزالی ہنسا ــــ تلخ ــــ طنز بھری ہنسی!

"یہ تو میں نے تمہاری خاطر ڈھونگ رچایا تھا کہ تم جی کے ارمان نکال لو۔ ورنہ ــــ"

"ورنہ؟" چچا نے حیرانی سے اس کا منہ دیکھا۔

"ورنہ میری شادی پہلے ہی ہو چکی ہے ــــ" اور اس نے پلیٹ کھسکا دی۔

"شادی...... ہو...... چکی ہے ــــ" چچی کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

"ہاں ــــ ہو چکی ہے ــــ"

"مگر وہ اس گھر میں نہیں آئے گی ــــ" چچی چیخیں۔

"مہرو ــــ مہرو ــــ" چچا نے تنبیہ کی۔

"آپ کے گھر وہ نہیں آئے گی ــــ مگر یہ گھر آپ کا نہیں ــــ میرا ہے"

"غزالی پاگل ہو گئے ہو؟" نازش نے اسے ٹوکا تھا!

"ہاں پاگل ہی سمجھو ــــ میرے گھر میں میری اور میری بیوی کی انسلٹ یہ میں برداشت نہیں کر سکتا ــــ"

"تو تمہیں گھر سے نکال رہا ہے ــــ" چچی نے اپنے خیال میں آخری حربہ استعمال کیا ــــ مگر وہ بھی خالی گیا۔

"جو تم سمجھو ــــ ڈولی کو جلد ہی یہاں شفٹ ہونا ہے ــــ"

"بھاڑ میں گئی ڈولی!" چچی کا بلک بلک کے رونا ــــ خدا کی پناہ!

"بس بس اماں۔ بہت برداشت کر چکا ــــ اب آپ اسے کچھ نہیں کہیں گی۔ یہ گھر ڈولی کا ہے۔ وہ آئے گی۔ رہے گی! جی چاہے تو آپ لوگ دس بیس دن یہاں ٹھہر سکتے ہیں...... نہیں تو ــــ"

"کیا بک رہے ہو غزالی ــــ ماں باپ سے یہ ــــ" غصے میں وہ جملہ بھی پورا نہ کر سکا۔

"تم جیسے پڑھے لکھے جاہلوں ہی نے ان بڈھوں کا دماغ خراب کیا ہے.... میں ــــ میں اپنی انسلٹ کبھی نہیں جھیل سکتا ــــ" وہ غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔

"بس غزالی ــــ بس ــــ بیٹا ــــ جو تمھیں کہنا تھا کہہ چکے ــ اب ایک لفظ اور نہیں سنوں گا۔" چچا نے پُر سکون لہجے میں کہا ــــ مگر اس سطحی سکون کے نیچے سمندر میں کتنا تلاطم ہے یہ نازش سمجھ رہا تھا۔ "میری زندگی میں تم اپنی ماں کے ساتھ بدتمیزی نہیں کر سکتے۔"

"اور وہ میری بیوی کی بے عزّتی کرتی رہیں؟" غزالی غرّایا۔

"آپ ہی نے اماں کو سر چڑھایا ہے ــــ"

"ماں کے پیروں کے نیچے جنّت ہوتی ہے بیٹا۔" چچا کیسے یہ سب برداشت کر رہے تھے۔؟

"میں جنت دوزخ، خدا رسول، مذہب وزہب کسی کو نہیں مانتا۔ یہ جاہلوں کی دنیا ہے۔ فراری ذہنیت، ہنہ!" اب پوری طرح اس کی نقاب اتر چکی تھی۔

"غزالی تم باہر چلو ــــ اس نے دوست کا ہاتھ پکڑا ــــ

"ہٹ جاؤ تم ــــ"

"بس چانٹا ماروں گا اگر تم نے ماں باپ سے بکواس کی —"

"مر گئے چانٹا مارنے والے —"

"ارے چانٹا تو اسے میں ماروں گی —" چچی جھپٹیں مگر چچا نے انھیں اپنی باہوں میں جکڑ لیا۔

"ارے مہرو — مہرو — ہوش میں آؤ، جوان لڑکا ہے —"

"ہوش — ؟ حواس ؟ یہ جوان لڑکا کبھی ایک دن کا بچہ تھا نا؟ جس کو میں نے خونِ جگر پلا پلا کر بڑا کیا ہے — سدا کا روگی تھا دن رات اسی کی تیمارداری اور خدمت میں لگی رہوں تھی۔ اس کی ہر ضد میں نے پوری کی — یہ اپنی باتیں ساری مجھ سے کہدے تھا — میں سن کر ولاسا دوں تھی — تمھیں برا کہے تھا۔ کہتا تھا ابا میاں مارتے ہیں۔ ڈانٹتے ہیں۔ پیسے نہیں دیتے ...... میں اس کو کلیجے سے لگا کر سمجھاؤں تھی۔ بیٹا یہ سب تیرے بھلے کے لیے کرتے ہیں۔ ماں باپ تو اولاد پر جان نچھاور کرتے ہیں۔ ہائے اپنے بڑھاپے کا سہارا سمجھا۔ اس نے ضد کی، میں ولایت جا کر اعلیٰ ڈگری لاؤں گا — اور تو سب تنویر کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ ایک پنشن رہ گئی تھی۔ وہ بھی آدھی بکوا دی — میں ضد نہ کرتی تو کیوں تم پنشن بیچ ڈالتے ... اسے ولایت بھیج دیا۔ پھر یہ یہاں رہ پڑا۔ سب مخالف تھے۔ تم بھی برا بھلا کہو تھے — میں نے کہا جانے دو — اس کی تمنّا ہے پوری کر دو۔ ہمیں کیا — کبھی بلا کر دیکھ لیں گے — کبھی یہ ہمیں بلالے گا۔ ارے میں نے کیا کیا نہیں کیا اس ناخلف ناہنجار کے لیے۔ آج یہ دو ٹکے کی چھوکری کے لیے میرے منھ آرہا ہے —"

"بس اماں بس — بہت ہو چکا —"

"— بیوی — یہ سب اسی کا تو نتیجہ ہے" چچا کہہ رہے تھے۔

"پاپا آپ نے ہمیشہ ہم سب کے مقابلے میں اماں کا پارٹ لیا۔ ہمیں ہمیشہ

سختی اور تکلیف میں رکھا۔ ہم اب اپنی زندگی خود بنا کر رہنا چاہتے ہیں۔ آپ پا لوگوں کے پنجے سے نکل کر آزاد زندگی بسر کر رہے ہیں تو آپ کو کیوں برا لگتا ہے، آپ اپنی راہ چلیے۔ ہم لوگوں کو کیوں ستاتے ہیں ـــ"

"ارے اب تو باپ کے منہ بھی آنے لگا ـــ ان سے بھی زبان ـــ"
چچی بے قابو ہوئی جا رہی تھیں۔

"میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ یوں ہی چیخوں گا۔ زبان چلاؤں گا" کون کہتا ہے بوڑھی عورتیں ہی ہسٹریا مچاتی ہیں تو کس قدر مرد ہو کر ہسٹرک ہو رہا ہے"۔ غزالی غزالی ہوش میں آ۔ یار ـ"

"میں ہوش میں ہوں! عمر بھر زیادتیاں جھیل کر بھی ہوش نہیں کھوئے میں نے ـــ پیدا کیا ـــ پالا ـــ پڑھایا ـــ ہنھ۔ یہ ہم پر احسان ہے؟ جو اولاد پیدا کرتے ہیں ـــ وہ یہ سب بھی کرتے ہیں ـــ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ پڑھی لکھی اولاد ماں باپ کے ہاتھ میں کھلونا بن جائے ـــ"

چچی گرنے لگیں چچا نے انھیں فرش پر ڈال دیا۔ اس نے لپک کر ان کے سر کے نیچے تکیہ رکھ دیا!

"شکریہ بیٹا۔ تمھارا بہت بہت شکریہ۔ اب تمھیں ان جاہل ماں باپ سے کوئی دکھ نہ پہنچے گا۔ غلطی پر ہم ہی تھے ـــ" یہ کہہ کر چچا اس کی طرف مڑے۔

"نازش بیٹے۔ کیا ایک کمرے کا کہیں بندوبست کر سکو گے؟ آج ہی ـــ اور دو سیٹیں ـــ امریکہ جانے کے لیے ـــ ٹکٹ میرے پاس ہیں ـــ جتنی جلدی ہو سکے"۔ ان کی آواز لرز رہی تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں اور وہ زبردستی اپنے کو گرنے سے سنبھالے ہوئے تھے۔

"آپ بیٹھ جائیے چچا ـــ سب ہو جائے گا۔ سب ہو جائے گا ـــ غزالی معافی مانگو چچا سے ـــ" اس نے ڈانٹ کر کہا۔

"معافی؟ ہنھ ـــ" اور وہ مڑ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگا ـــ لعنت

ہے تم پر۔" اس کے منہ سے نکلا۔"

اس کے بعد اس نے غزالی سے کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔ جو بوڑھے ماں باپ کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتا ہے اس سے دوست کیا توقع کرے! مگر کل وہ بےچین ہو گیا۔ کچھ بھی ہو۔ غزالی کی ماں تھیں۔ اُسے خبر ملنی چاہیے۔ شاید آ سکے۔ شاید ماں کی روح سے اور باپ سے معافی مانگ لے تو خدا بھی معاف کر دے۔

اسے امید نہیں تھی کہ اتنی آسانی سے لندن فون مل جائے گا۔ غزالی کی آواز میں نیند تھی۔

"ہلو۔ ہو از اسپیکنگ..."

"غزالی میں نازش بول رہا ہوں۔ دلی سے۔"

"او۔ نازش۔ کہو کیسے یاد آ گئی۔ خیریت ہے؟"

"نہیں..... اور اس کی آواز بھرّا گئی۔

"کیا ہے۔ کیا بات ہے۔ پاپا کیسے ہیں"؟ غزالی کے لہجے میں تشویش تھی۔

"تمھاری ماں آج اس دنیا سے چل بسیں۔۔۔ تمھاری جدائی کا داغ دِل پر لیے۔"

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی۔ جب غزالی بولا تو اس کی آواز آنسوؤں سے بھیگی محسوس ہو رہی تھی ۔۔۔ پاپا۔ کا۔ کیا حال ہے۔

"کیا حال پوچھتے ہو۔ اب آؤ گے تو دیکھ لینا۔ آ رہے ہو نا....."

دوسری طرف سے کسی نے کچھ پوچھا۔ غزالی کا جواب اسی نے سنا۔

"ممی۔ ممی کی ڈیتھ ہو گئی ۔۔۔" تم آجاؤ غزالی ہم پرسوں تک انتظار کر لیں گے ۔۔۔"

"کل.... نہیں۔ کل کیسے چل سکتا ہوں۔ امپوسیبل ۔۔۔"

"کوشش تو کرو ۔۔۔"

"اب کیا کروں گا کوشش کر کے۔ اماں کو زندگی میں تو مل نہ سکا ___ اب ان کو مردہ ___ نہیں نازش نہیں ___"

"اپنے پاپا کا تو خیال کرو غزالی ___"

"میں آؤں گا پاپا کے پاس ___ یہاں کے کاموں سے نبٹ لوں بہت ضروری کام پھیلے ہیں ___ تم پاپا سے کہہ دینا ___ اس وقت آنے سے مجبور ہوں۔ میرے بور پاپا۔ میں سچ مچ ان کی طرف سے پریشان ہوں نازش ___ ممی پر وہ فدا تھے ___" نازش کے منہ سے مایوسی میں نکلا ___" تو تم نہیں آؤ گے ___ اپنی ماں سے ملنے ___"

"ماں اب کہاں ہیں ___؟ کاش ___ کاش ___" وہ اور کچھ نہ کہہ سکا

"ہاں کہو غزالی کاش ___ کیا ___"

"نہیں کچھ نہیں" ایک آہ کے ساتھ غزالی نے کہا۔ بابا اور باقی سب لوگوں کو میری مجبوری بتا دینا ___ مگر میں آؤں گا نازش ___ کچھ عرصے بعد ___"

نازش نے رسیور پٹخ دیا۔

اور اب وہ کیسے یہ سب سہیلی میاں کو بتائے؟ وہ سچ ہی کہتے تھے .... کیا فائدہ تھا اطلاع کرنے سے؟

اختر علی نے اس کا بازو چھوا ___ بیٹا ___ کیا سوچ رہے ہو؟ تھک گئے ہو ___ جاؤ سو جاؤ۔ برف کی سلیں آگئی ہیں وہ میں رکھوا دوں گا ___"

وہ چونک پڑا "نہیں بابا ___ میں موٹر میں سو لیا تھا۔

وہ اٹھا۔ دو بڑے بڑے جست کے کھلے بکسوں میں برف کی سلیں رکھی تھیں۔ کمرہ ٹھنڈا رہے مگر گندا نہ ہو۔ کتنی نفاست پسند تھیں چچی!

---

(۶)

کل سے خورشید بانو کا دل بے حد گھبرا رہا تھا۔ اباجی اس کے گلے ایسے پڑے تھے کہ نہ ان کو چھوڑ کر کہیں جا سکتی تھی اور نہ لے کر۔ سال بھر سے کینسر میں مبتلا تھے۔ شروع میں تو صاحب زادے صاحب نے بھی علاج دوا کیا۔ تیمار داری کا بھی ڈھونگ رچایا۔ بیٹیاں بھی دس دس پندرہ پندرہ دن آکر رہ گئیں۔ اور ہر وقت "اباجی" کو طاقت کی غذائیں کھلانے کی تاکید کرتیں۔ انڈا مرغی کی یخنی، دودھ پھل۔ اباجی کھاتے یا نہ کھاتے وہ اور ان کے بچے تو کھاتے ہی تھے، اس کی طاقت بھی تو باپ کو مل جاتی ہوگی نا ــــ مگر جیسے جیسے مرض بڑھتا گیا سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ بیٹا صبح کا گیا شام کو آتا۔ پوتا پوتی کبھی کبھار داداجی کی مزاج پرسی کر لیتے وہ خود بھی وہم کے مارے ان کے پاس جانے دینا نہ چاہتی تھی۔ ان کے دونوں چھوٹے بیٹے تو پاکستان جا ہی چکے تھے اور یہ بہانا کیسا کارگر ہے کہ آنے کے لیے ویزا ہی نہیں ملتا۔ اب ساری مصیبت اسی کے سر ہے۔ کچھ ان کو بھی ایسی کل پڑ گئی ہے بہو کی کہ دم بھر کو الگ نہیں ہونے دیتے ــــ ذرا وہ گھر کے کام میں لگی اور آواز

پڑی" بہو۔۔۔ بہو۔۔۔ بیٹی۔۔۔ ذرا پاٹ پر بٹھا دینا۔ ذرا پانی دے دینا۔۔۔
حد ہے۔ کھانا پلانا، کپڑے دھونا، کپڑے بدلنا نہلانا اور اب پاٹ لگانا سبھی
کام اسی پر پڑ گئے ہیں۔ جب سے نوکر بھاگا تب سے۔ آنکھیں بند کر لیتی ہے
منھ پھیر لیتی ہے مگر دل نہیں مانتا کہ بیچارے لب گور بڑے میاں کو گندگی
میں پڑا رہنے دے۔۔۔ اور وہ چھینپے اور چاہنے والے لخت جگر آتے ہیں تو
ایسے سوال و جواب کرتے، ذرا ذرا سی بات پر یوں الجھتے ہیں جیسے فرض
میرا ہے ان کا نہیں۔ کتنے دن ہو گئے اماں کے پاس نہیں جا سکی۔ بیماری
میں گئی بھی تو آٹھ دن سے زیادہ نہ رہ سکی۔ اماں اور ابا میاں میرے حالات
سمجھتے ہی نہیں۔ مجھے واپس آنا پڑا تو دونوں ہی خفا ہو گئے۔ پھر آخر میں
کیا کروں۔ ذمہ داریاں میری بھی ہیں۔ سب سے زیادہ بچوں کی فکر رہتی
ہے۔ وہ میرے بغیر ہراساں ہو جاتے ہیں۔ بچی پر سارا کام پڑ جاتا ہے۔ چھوٹے
بچے کتنے پریشان ہو جاتے ہیں۔ اور کسی کو تو فکر نہیں۔ بات یہ ہے کہ جب
اپنا گھر بار بال بچے ہوں تو سب سے پہلے انسان پر ان کی ذمہ داری ہوتی
ہے۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر کیا شادی کے بعد ماں باپ کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے؟
مگر میں نے تو ہمیشہ کوشش کی کہ ابا میاں اور اماں کی خدمت کروں مگر
مجبور ہوں کہ کوئی خدمت کر سکوں نہ ان بیچارے بڑے میاں کو چھوڑنے والی
حالت اور نہ خود اس میں اتنی ہمت ہے کہ بڑے میاں سے کہے دس بیس دن
کو ان کی بیٹیوں کو بلا کر خدمت کرائیں۔ اپنے ماں باپ کے پاس تو ہو آؤں۔
ابا میاں بیمار ہوئے تو تب بھی نہ جا سکی تھی مگر اس وقت تو اماں میں طاقت
تھی۔۔۔ شاہین پاس تھی۔۔۔ خدمت کرنے والے بھی تھے، پیسہ بھی تھا
۔۔۔ مگر اب۔ اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ چالیس میل کے فاصلے پر ہیں۔ مگر
ان کے پاس نہیں جا سکتی۔ ان کی خدمت نہیں کر سکتی۔ ان کو پیسہ نہیں دے
سکتی۔ اچھا وہ نہ جا سکے۔ مگر ساری چھٹیاں گزر گئیں۔ بلا سے لڑکیوں

اور لڑکے کی ہی سے باپ نے کہا ہو تا کہ جا کر نانی کو دیکھ آؤ۔ ابا میاں کا پرچہ آیا تھا کہ اماں کو دل کی تکلیف ہو گئی ہے' اس وقت کیسا تڑپی مگر نہ جا سکی۔ بڑی لڑکی سے کہا۔ ممّی تم ہی اپنے پاپا سے پوچھ کر دس بیس دن کے لیے نانی اماں کے پاس چلی جاؤ۔ میں تو تمھارے دادا کی وجہ سے قید ہوں۔ مگر کیا تم لوگوں پر میرے ماں باپ کا کوئی حق نہیں؟" ممّی یوں بھی نانی کو بہت چاہتی ہے' فوراً تیار ہو گئی مگر جب اپنے باپ سے کہا کہ "میں کچھ دن کو نانی اماں اور نانا ابّا کے پاس چلی جاؤں تو انھوں نے منع کر دیا۔ ارے بھئی تم کہاں جاؤ گی۔ تمھارا فائنل ایر ہے۔ پڑھو اچھی طرح کہ فرسٹ کلاس آئے ممّی نے کہا تو پھر ممّی کو جانے دیجیے کوئی ممّی تو نہیں ہے ان کے پاس تو ناک چڑھا کر بولے" چلی جائیں ان کی مرضی ہے۔ اباجی کی حالت دیکھ کر بھی وہ جانا چاہیں تو کون منع کرتا ہے ــــ جی چاہے پھونک ڈالے اس گھر کو' ان ذمہ داریوں کو۔ مگر وہ بزدل' بے ہمت بے حوصلہ ہے نا ــــ سوا رونے کے کچھ بھی نہ کر سکی ــــ میرے ابا میاں۔ کیسے وہ اکیلے مصیبت اٹھا رہے ہوں گے۔ کوئی خط بھی نہیں بھیجا۔ ناراض ہوں گے۔ کتنے بھروسے سے انھوں نے مجھے بلایا تھا ــــ مگر میں نہ گئی ــــ وہ بھی نہ گئے' بچے بھی نہ گئے' کیا سوچا ہوگا ابا میاں نے ــــ کتنا دکھ ہوا ہوگا اماں کو ــــ جانے کون خدمت کر رہا ہے ــــ کس کا علاج ہے۔ میرے خط کا جواب بھی تو نہیں ملا۔ دونوں بھائیوں نے تو قطع تعلق ہی کر لیا ہے جب دو سال پہلے ابّا میاں سخت بیمار ہوئے تھے تب بھی یہی ہوا تھا کہ بس وہ پانچ سات دن ان کے پاس رہ سکی تھی اور پھر اسی نے دونوں بھائیوں کو لمبے لمبے خط لکھے تھے ــــ کتنا سمجھایا تھا ــــ "بھیا ــــ میں تو مجبور ہوں مگر تم تو مجبور نہیں ــــ ابا میاں کو وہاں بلا کر علاج کراؤ ــــ یا یہاں چھٹی لے کر آجاؤ۔ اپنی بیوی یا بیٹی کو بھیج دو ــــ خرچ کے لیے کافی روپے بھیجو' کیا اسی دن کے لیے ماں باپ بچوں کو

پال پوس کر، جان کھپا کر بڑا کرتے، پڑھاتے لکھاتے ہیں؟ لڑکیاں سسرال چلی جائیں، لڑکے دوسرے دیس بسالیں اور ماں باپ پڑے ایڑیاں رگڑتے رہیں؟

وہ کلام پاک پڑھا کرتی تھی۔ اماں نے اُسے باترجمہ قرآن پڑھنے کی عادت ڈالی تھی۔ کچھ بھی ہو تا صبح سویرے چند منٹ وہ ضرور تلاوت کر لیتی تھی۔ اس نے دونوں بھائیوں کو کلام پاک کا حوالہ دیا کہ خدا نے تاکید کی ہے کہ اپنے بوڑھے ماں باپ کی خدمت کرو ـــــ انھوں نے بچپن میں تم پر رحم کھایا تھا ـــــ اب بڑھاپے میں تم ماں باپ پر رحم کھاؤ ـــــ اس نے لکھا تھا زرا کلام پاک کا پندرھواں پارہ کھولو ـــــ سورہ بنی اسرائیل کی تیئیسویں اور چوبیسویں آیت نکال کر پڑھو ـــــ ارے تم کیا پڑھوگے میں اس کا ترجمہ لکھ رہی ہوں وہی پڑھ لو:۔

"اور تمھارے پروردگار نے یہ بات ٹھیرا دی ہے کہ اس کے سوا اور کسی کی بندگی نہ کرو۔ اور اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔ اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک یا دونوں تمھاری زندگی میں بڑھاپے کی عمر تک پہنچ جائیں (اور ان کی خدمت کا بوجھ تم پر آپڑے)، تو ان کی کسی بات پر اف نہ کرو۔ (یعنی کوئی بات کتنی ہی ناگوار گزرے مگر حرف شکایت زبان پر نہ لاؤ) اور نہ جھڑکنے لگو۔ ان سے بات چیت عزت کے ساتھ کرو۔ ان کے آگے محبت اور مہربانی کے ساتھ عاجزی کا سر جھکائے رکھو۔ ان کے حق میں ہمیشہ دعا کرو کہ پروردگار جس طرح انھوں نے مجھے صغر سنی میں پالا پوسا اور بڑا کیا تو اسی طرح تو بھی ان پر رحم کیجیو ـــــ"

بھیا۔ ماں باپ کی اطاعت اور خدمت کا یہی وقت ہے اب یہ کچھ عرصے کے مہمان ہیں! ہو سکتا ہے تم ان سے خفا ہو۔ مگر ان کا غصہ، خفگی یاد کرنے کی جگہ، ان کی خدمت، ان کی محبت، ان کا ایثار و قربانی یاد کرو ـــــ

یہ وقت ان کو سہارا دینے کا ہے، مدد کرنے کا ہے۔ خدمت کرنے کا ہے وہ دوا ایک اچھے نوکر تک نہیں رکھ سکتے" تم لوگ ماشاءاللہ ہزاروں کما رہے ہو۔ تمھاری اولادیں لندن اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پا رہی ہیں۔ عیش سے رہتے ہو! کس کی بدولت؟ انھیں ماں باپ کی جوتیوں کا تو صدقہ ہے —"

اور بھی یاد نہیں کیا کیا لکھا تھا — اسے امید تھی کہ جواب نہ آئے، مگر بھائی خود آئیں گے اماں اور ابا میاں کے پاس، مگر کچھ بھی نہ ہوا — تنویر بھیا نے اکھڑا اکھڑا جواب دیا" باجی تمھارا نصیحت نامہ ملا۔ اماں کی بیماری کی خبر سے بہت قلق ہوا مگر ہمیں تو ادھر ادھر سے خبر ملی۔ ابا میاں نے کچھ بھی نہیں لکھا۔ روپیہ تو کئی بار میں نے بھیجا تھا مگر ابا میاں نے واپس کر دیا — اب میں ان کو پچاس ساٹھ ہزار روپیہ تو بھیج نہیں سکتا — اتنے کی ان کو ضرورت بھی کیا ہے۔ آخر میرے بچے ہیں، وہ جوان ہیں ان کی تعلیم کا بہت خرچ ہے۔ چھوٹے بچوں کا خرچ بھی ہے اور پھر ان کا مستقبل بھی ہمیں بنانا ہے۔ بزنس کوئی خاص نہیں — خدا جانے کیوں سب کو یہ خیال ہو جاتا ہے کہ جو باہر جاتا ہے وہ لکھ پتی ہو جاتا ہے — کہاں سے اتنا روپیہ لاؤں کہ ہزار دو ہزار ہر مہینے ان کو بھیجوں؟ مگر تمھارے کہنے کے مطابق سو ڈالر ابھی روانہ کر دیے ہیں۔ میں یا نازنین ابھی نہیں آ سکتے۔ ہمارا بزنس یہاں سے منتقل ہونے والا ہے شاید مجھے حیدرآباد کی شاخ میں بھیجا جائے گا۔ اس وقت ضرور ابا میاں اور اماں کے پاس جانے کی کوشش کروں گا۔ ابا اور اماں کی خیریت تم مجھے لکھ دیا کرنا — اور تو کسی سے امید نہیں" — اف بھیا — تمھیں اپنی اولاد کی فکر ہے — بیوی کی خوشنودی کی تو سدا ہی فکر رہی — سسرال والوں کا کتنا خیال ہے — اور ابّا میاں کی بیماری کے لیے سو ڈالر ساڑھے آٹھ سو روپے — بھیجے ہیں — شرم آنی چاہیے! اور غزالی۔ اف اس کا جواب تو دل

کو جیرگیا!

"باجی نصیحت کرنے کا مرض امّاں کی طرح تمھیں بھی ہے۔ امّاں نے میرے ساتھ کیا کیا؟ ابا میاں نے کس طرح مجھے ذلیل کیا۔ اب تمھارے ذریعے مدد مانگتے ہیں۔ میں ان کی خدمت کروں جاکر؟ میری بیوی ان کی خدمت کرے؟ جس کو ذلیل کیا انھوں نے۔ وہ بیچاری ان کے گھر میں قدم رکھ سکتی ہے، مقدّس گھر ہے نا ان کا؟

یہ خدا رسول اور قرآن کی باتیں تو تم مجھ سے کرو نہیں۔ میں نہ تمھارے قرآن کو مانتا ہوں نہ مذہب کو ـــ کسی مذہب کو بھی نہیں! اسی مذہب کے نام پر دنیا میں ساری ناانصافیاں اور ظلم و ستم ہو رہے ہیں اور ہوتے ہیں! خیر چھوڑو میں تو ناستک ہوں۔ دہریہ ہوں۔ تم تو بڑی باخدا ہو تم کیوں نہیں جاکر ماں کی خدمت کرتیں؟ میاں جانے نہیں دیتے ـــ اپنے باپ کی خدمت کرا رہے ہیں! خوب ـــ وہ خود اپنے باپ کی خدمت کریں۔ تم اپنی ماں کی سیوا کرو ـــ میں کیسے اپنا کام چھوڑ کر آ سکتا ہوں۔ اور کیوں آؤں؟ آخر بڑھاپے میں اس قدر زندگی اور عیش و آرام کی ہوس، دوا علاج کی فکر کیوں ہو جاتی ہے۔ ابا میاں پچھتر سے نکل گئے ہوں گے۔ اماں بھی شاید ستر کی ہو جائیں گی ـــ مگر ہر قسم کے شوق ـــ ہر قسم کا آرام چاہتے ہیں یہ لوگ۔ بھئی مجھے تمھارے ان خطوں کے جواب دینے کی فرصت نہیں۔ خیر اب اتنا کہہ دوں کہ ..... تم اپنی جنت کھری کرلو۔ اور اماں کی سیوا اور خدمت کرو جاکر۔"

"اماں یا ابا میاں سن لیتے تو ان پر کیا گزرتی۔ اماں تو یوں ہی رو دیا

کرتی تھیں کہ خدا جانے میری اولاد خدا رسول سے بیگانہ کیوں ہوتی جا رہی ہے۔ اس دفعہ جب غزالی نے ایسی باتیں ان سے کی تھیں تو کیسا کیسا روئی تھیں۔ کہتیں میں نے تو سب کو مذہب کی تعلیم دی تھی۔ خدا کا خوف دل میں بٹھایا تھا میری قسمت کہ میری تربیت نے اثر نہ کیا۔ میرا خون خراب نکل گیا.....

اف۔ کس قدر بے درد لڑکا ہے یہ!

خورشید کے سامنے دونوں بھائیوں کے خط پڑے تھے۔ ماں باپ کے مرنے کی امید میں شاید۔ اسی زمانے کی اولاد بازدہ سکتی ہے۔ نہیں تو ان کا سایہ خدا کی رحمت کا سایہ ہوا کرتا تھا۔ اور پھر ہمارے ماں باپ ۔۔۔ ایسے چاہنے والے۔ ایسے ایثار کرنے والے۔ اف خدایا! مجھے طعنے دیتا ہے ۔۔۔ وہ کیا جانے میرے مسائل ۔۔۔ ہونا عورت اور پڑتا کسی بے درد کے پالے تو دیکھتی ۔۔۔ وہ جابر شخص مجھے جانے ہی کہاں دیتا ہے!

جانے اماں کیسی ہیں۔ وہ بڑے میاں بیچارے کیسے مرض میں مبتلا ہیں۔ حالت کچھ اور بگڑتی جا رہی ہے۔ مگر کیا میرا ہی فرض ہے؟ ان کی بیٹیاں ۔۔۔ مگر وہ کیوں آئیں گی بھلا ۔۔۔

ایک شاہین تھی اماں کو کیا ناز تھا اس پر۔ کہتی تھیں یہ ہے میرے بڑھاپے کا سہارا ۔۔۔ خورشید اور لڑکے تو نالائق نکل گئے۔ یہ تو میرا بیٹا بھی ہے اور بیٹی بھی ۔۔۔ کما کر بھی کھلا رہی ہے خدمت بھی کر رہی ہے ۔۔۔ آج کل کی اولاد کو میری شاہین سے سبق لینا چاہیے ۔۔۔! اس وقت میں شرمندہ ہو جاتی تھی۔ سچ ہی کہتی ہیں اماں! واقعی اس نے ان کی بہت خدمت اور خیال کیا ہے ۔۔۔ بیمار پڑی تھیں۔ معمولی انفلوانزا اور بخار تھا۔ تو شہر لا کر اسپتال میں داخل کیا، قرض لیا اور دن رات ان کی خدمت

گی! اس وقت میں نے اس کی کتنی تعریف کی تھی۔" بھنو خدا تجھے خوش رکھے
اس کا اجر دے۔ ماں باپ کی خدمت سے بڑھ کر سعادت اور کیا ہوگی۔"
مگر جانے اسے مجھ سے کیا چڑ تھی۔ کبھی سیدھے منھ بات نہ کرتی۔
طنز و طعن کرتی رہتی تھی" ہاں یہ ساری سعادت میرے ہی حصے میں آ گئی
ہے! بھیا اور بھائی جان نے یوں منھ موڑا۔ آپ اپنی سسرال والوں کی
خدمت اور میاں کی ناز برداری میں لگی ہیں۔ ایک میں فالتو ہوں۔ میں چپ رہ
گئی۔ شرمندہ بھی ہوئی ——— اور سوچا کبھی یہ بس مجبوری کر ا رہی ہے۔
اس کے دل میں کچھ اور ہے ——— اور پھر وہی ہوا ——— کر لیا نا بیاہ اپنی
پسند کا۔ چلی گئی ولایت۔ رہ رہی ہے ٹھاٹ سے ——— سنا ہے شان سے
رہتی ہے کہ ہمارے یہاں کی امیرزادیاں بھی نہیں رہیں گی۔ کہاں وہ حال
کہ ہر لڑکے میں عیب نکال کر شادی سے انکار کر دیتی اور بڑے فخر سے
سر اونچا کر کے کہتی" میں اپنی امی اور ابو کی خدمت کروں گی۔ مجھے نہیں چاہیے
میاں اور بیوی کا جھنجھٹ۔ باجی کی طرح کہ چار دن کو آ کر نہ رہ سکوں ———
خیر ماں باپ کی خدمت کا صلہ تو خدا نے اسے خوب دیا ——— تئیس برس کی عمر
میں ایسا شوہر مل گیا جو عیش کرا رہا ہے ——— وہ کیوں نہ کرتی بیاہ؟ آج کل
تو سبھی اپنا آرام دیکھتے ہیں ——— شان سے رہنا چاہتے ہیں۔ ہر کسی کے منھ
سے" اسٹنڈرڈ آف لِونگ" کا جپ جاسن لو ——— فرج نہ ہو تو کھانا سڑ جاتا ہے
گیس اور کوکر نہ ہو تو کھانا پک ہی نہیں سکتا ——— موٹر کے بغیر بھی زندگی
کوئی زندگی ہے! اور اب یہ نئی مصیبت ٹی وی کی نکلی ہے۔" اسٹیٹس
سمبل" بن گیا ہے کمبخت۔ زیور بیچو، بنک سے قرض لو یا قسطوں پر خریدو
مگر ٹی۔ وی۔ ضرور ہو ——— تو سب ——— بیماری میں علاج نہ ہو ——— کھانے
پینے کو نہ ہو مگر ٹی۔ وی تو ضرور ہونا چاہیے ——— بچے تو ہمارے بھی غدر
کر رہے ہیں۔ مگر وہ ——— خیر اس معاملے میں عقل سے کام لیتے ہیں ——— مگر کب

تک ـــــ کب تک وہ ہمارا سہیں گے ـــــ اماں بیچاری کی تو ساری اولاد ہی نالایق نکل گئی ـــــ اب دیکھیں ہماری اولاد .... ہائے اللہ ـــــ

ـــــ اگر ہمارے بچوں نے بھی یہی کیا ـ کریں گے ہی ؟ ـــــ کیوں نہ کریں؟ ہم نے اپنے ماں باپ کو کم دکھ دیے ہیں .....

ساری رات خورشید کو جاگتے اور یہ سب سوچتے گزر گئی ـ لگتا تھا کسی نے بستر پر کانٹے بچھا دیے ہیں ـ صبح کو وہ اپنے کو گھسیٹ کر اٹھی ـ سسر کی دیکھ بھال کی ـــــ دودھ اوولٹین پلایا ـ میاں کو ناشتہ کرایا ـ چھوٹی لڑکی اور بڑا لڑکا کالج اور اسکول جا رہے تھے جلدی جلدی ان کے لیے ناشتہ تیار کیا .....

" کیا بات ہے ممی ـــــ چہرہ بہت اُترا ہے" لڑکی نے پیار سے پوچھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ـ" کچھ نہیں خالدہ ! اماں کی فکر لگی ہے ـــــ "

" ممی آپ چلی جائیے نانی اماں کے پاس ـــــ "

" تمھارے دادا کو کس پر چھوڑوں ؟ "

" پھوپی جان کو بلالیں گے پاپا ـــــ "

" ہنھ ! جانے دیں گے باوا تمھارے ؟ "

" آپ تو خواہ مخواہ بدگمانی کرتی ہیں ـ انھوں نے تو اس دن بھی کہا تھا کہ چلی جاؤ ـــــ "

" منھ سے سبھی کچھ کہہ دیا جاتا ہے بی بی ـ "

" آپ خود ہی نہیں جانا چاہتی ہیں ـــــ پاپا کا تو بہانہ ہے ' آپ کا دل خود سخت ہے ـــــ "

اور وہ پیر پٹختی چلی گئی ـــــ یہ بچے ـــــ یہ بچے ـــــ یہ بھی اس کے نہیں ـــــ باپ کا پارٹ لیتے ہیں !

ابھی نو بھی نہیں بجے تھے کہ کسی نے ایک پرچہ باہر سے لا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا

"خورشید باجی ــــ رات چچی جان خدا کو پیاری ہوگئیں ــــ نازش"

وہ پرچہ ہاتھ میں لیے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ روئی نہیں! رونا بھی تو کسی ہمدرد کے سامنے آتا ہے ــــ کچھ بولی بھی نہیں ــــ سسر جلاتے رہے۔ وہ ان کے پاس نہیں گئی ــــ میاں کے پاس کسی کو بھیجا نہیں! کیا فائدہ ان پہ کیا اثر ہوگا۔ ہاں اس کی مری تھی۔ اس کا تو کوئی نہیں مرا تھا۔ بڑے میاں بھی سال بھر سے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ توبہ ــــ توبہ ــــ اللہ معاف کرے ــــ مگر ــــ بات ہے تو سچ۔

اس کے اندر سے جیسے کوئی چیز ابل رہی تھی۔ شعلے سے اٹھ رہے تھے اب وہ کسی کی پروا نہ کرے گی۔ جائے گی۔ اپنی اماں کو دیکھنے۔ اپنے ابا میاں کے گلے سے لپٹ کر رونے ــــ اماں چل بسیں۔ کانٹا نکل گیا۔ سب سے زیادہ جلن تو انھیں اماں ہی سے تھی! اب کوئی بلانے والا نہ رہا۔ اس کے دکھ درد پر تڑپنے والا نہیں رہا۔" کتنے گھنٹے وہ بیٹھی رہی۔ وقت کا احساس مٹ چکا تھا اور بچپن سے آج تک کی باتیں دماغ میں گونج رہی تھیں ......

"ارے کیا ہوا؟ کیسی بیٹھی ہو؟ ابا چلا رہے ہیں سن ہی نہیں رہیں" مگر وہ اسی طرح سن بیٹھی رہی۔

"ممی ــــ ممی ــــ کیا ہوا ــــ کیسا جی ہے؟" اب بھی وہ نہیں بولی۔

"ممی ــ بیٹے نے پیار سے گلے میں باہیں ڈالیں"۔ کیا ہوا ممی؟"

اس نے گھٹنے کے نیچے سے پرچہ نکال کر میاں کے ہاتھ میں دے دیا

لو ــــ مبارک ہو ــــ کانٹا نکل گیا ــــ"

اس نے پرچہ پڑھا" ارے ــــ یہ کیا ہو گیا؟"

"کیا ہوا پاپا؟ ــــ ہائے نانی اماں!" خالدہ نے رونا شروع کر دیا۔

" خورشید ــــ ہم ابھی چلتے ہیں... جاؤ حسیب ٹیکسی لاؤ ــــ"

حسیب باہر بھاگ گیا ۔۔۔

"خالدہ بیٹی ۔ اپنا میرا اور اپنی ممی کا سامان ٹھیک کر لو ۔۔۔"

"نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔" خورشید چیخی !

"کیا نہیں ؟ اب بھی نہیں جاؤ گی ؟" میاں نے حیرت سے کہا !

"جاؤں گی ۔ ضرور جاؤں گی ۔ مگر اور کوئی نہیں جائے گا۔"

اس کی آواز ۔۔۔ خدا کی پناہ ۔۔۔ جیسے کوئی پاگل چیخ رہا ہو ۔۔۔

خالدہ نے سہم کر باپ کو دیکھا ۔

"تم کیا بک رہی ہو ۔۔۔ اماں کا آخری دیدار ہم سب کریں گے۔"

"آخری دیدار ۔۔۔ ؟ اچھا تو تم آخری دیدار کرو گے ؟ منت مانی تھی کہ میری اماں مر جائیں اور تم آخری دیدار کرو جا کر ۔"

"خورشید ۔۔۔ ہوش میں آؤ ۔۔۔ دماغ بالکل ہی خراب ہو گیا ہے ۔"

"پاپا ۔۔۔ پاپا ۔۔۔ اس وقت کچھ نہ کہیے ۔" خالدہ نے رو کر کہا ۔

"ہاں اب تک خراب نہیں ہوا تھا ۔ اب ہو گیا ہے ۔ میں اکیلی جاؤں گی بالکل اکیلی ۔۔۔ کوئی داماد ۔۔۔ کوئی نواسہ ، نواسی نہیں جائے گا ۔۔۔ زندگی میں جانے کی توفیق نہیں ہوئی اب آخری دیدار کریں گے ۔۔۔"

وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح گرج رہی تھی ۔ چہرے پر وحشت آنکھیں لال ہونٹ سفید ۔۔۔ پہلوان جیسا مرد اس کی حالت دیکھ کر شکست کھا گیا تھا گم سم کھڑا تھا ۔

ٹیکسی آئی مگر اس کی ہمت نہیں پڑی کہ بیوی کے ساتھ بیٹھ جائے حسیب کو اشارہ کیا ۔ وہ ڈرائیور کے پاس جا بیٹھا ۔۔۔ چالیس میل کا تو فاصلہ ہی تھا موٹر تیز چل رہی تھی اور خورشید پچھلی سیٹ پر اوندھی پڑی تھی ۔ سارا جسم سسکیوں سے ہل رہا تھا ۔۔۔ حسیب بار بار مڑ کر ماں کو دیکھتا ۔۔۔ اور ڈرائیور کو اشارہ کرتا ۔۔۔ تیز چلو ۔۔۔ اور تیز ۔۔۔"

(۸)

وہ بیوی کے سرہانے بیٹھے تھے۔ گود میں کلام مجید رکھا ہوا تھا۔ پارہ ختم کرنے کے بعد وہ اسے بند کرنا بھول گئے تھے۔

برآمدے میں بڑی دری کا فرش بچھا دیا گیا تھا۔ عالیہ بیچ میں بیٹھی ماتم وار بنی ہوئی سب سے پرسہ لے رہی تھی۔ محلے پڑوس کی عورتیں آکر اسے گلے لگا رہی تھیں۔ رو رہی تھیں اور "اللہ بخشے کیسی نیک بیوی تھیں" کہہ کر ان کی سخاوت، شرافت، خوش مزاجی، ملنساری، ہمدردی اور محبت کرنے کی عادت کا بکھان کر رہی تھیں۔ ہاں ہر مرنے والا چند دن کے لیے ان ساری صفات کا مالک بن جاتا ہے۔ وہ بھی جس میں ان صفات کی بہت کمی ہوتی ہے۔ وہ بھی جس کی صفات اور خوبیوں سے لوگ حسد، رقابت یا "احسان شناسی" کی بدولت جلتے رہتے ہیں ـــــ دکھ دیتے رہتے ہیں۔ بے اعتنائی کرتے رہتے ہیں۔ کہ اس میں وہ خوبیاں کیوں ہیں جو ان میں نہیں!

مہرو کے ساتھ بھی کتنے لوگوں نے یہی نہیں کیا ـــ؟

اس کے پلنگ کے نیچے برف کی سلیاں لگا دی گئی تھیں۔ کمرہ بے حد

ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ باہر جاڑے کی اداس، زرد دھوپ اب منڈیر سے نیچے اتر آئی تھی —— مہرو کے ہاتھ کا بنا ہوا بڑا سا پوری آستینوں کا سوئٹر اب اپنی گرمی بہت کچھ کھو چکا تھا۔ نازش نے ایک موٹا دُسّہ ان کے گرد لپیٹ دیا تھا۔ بلڈ پریشر کے ساتھ ساتھ وہ گٹھیا کے بھی تو مریض ہیں۔ اختر علی کے لاکھ اصرار اور نازش کی خوشامد کے باوجود وہ وہاں سے ہٹے نہیں تھے! ان کے سوا یہاں مہرو کا اور رہ ہے کون؟ کہاں ہیں وہ بچے جن پر وہ جان دیتی تھی! کتنا ناز —— کتنا غرور —— اور کتنی مسرّت تھی اسے جب وہ پہلے بچّے کی ماں بننے والی تھی —— اور ہر بار اسی ناز اور مسرّت میں اضافہ ہی ہوتا گیا؟ یہ کیا جذبہ ہوتا ہے؟ کیا فطرت ہوتی ہے عورت کی کہ وہ اتنے دکھ جھیل کر، موت کا کرب سہہ کر بھی ماں بننے پر ہمیشہ تیار اور اس پر ہمیشہ مغرور نظر آتی ہے۔ ماں ہی کیوں.... باپ کو بھی تو خوشی ہوتی ہے؟ انھیں یاد آیا —— یاد آیا!

ماں جی نے ایک دن اسے ٹوکا —— ارے سلّو —— ذرا سن تو —— بہو کا جی آج کل اچھّا نہیں ہے —— ذرا خیال رکھیو اس کا؟"

"کیوں کیا ہوا آپ کی بہو کو؟ اچھی خاصی موٹی تازی تو ہے"

ماں جی مسکرائیں" ہنہ نظر مت لگا —— اب تو خیر سے موٹی لگے گی ہی"۔

وہ حیرانی سے ان کا منہ دیکھنے لگا۔ ماں جی کو ہنسی آگئی!

"میرا بچّہ کتنا بھولا ہے بڑی بہو —— وہ بڑی بھابی سے مخاطب ہوئیں۔ ارے باؤلے میں دادی بننے والی ہوں —— " ماں جی کی آواز ہی نہیں انگ انگ سے مسرّت ٹپک رہی تھی!

بظاہر وہ شرما گیا۔ لیکن دل میں جیسے پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔ ایک امنگ اور غرور کے احساس سے اس کا بدن ٹوٹنے سا لگا —— وہ باپ بنے گا —— ایک منّے سے پیارے سے بچے کی کلکاریاں اس کے اس بڑے سے سونے آنگن میں گونجیں گی وہ ماں جی کی نظر بچا کر اپنی صحنچی کی طرف چل دیا۔

مگر ـــ مگر مہرو نے خود اس سے کیوں نہیں کہا؟ یہ خوش خبری سب سے زیادہ اس کے منہ سے سننے کا حق دار وہ تھا۔ اس نے مہرو سے اس کی شکایت کی تو وہ لجائی، شرمائی اور اس کے سینے میں منھ چھپا لیا۔ اب وہ سمجھا کہ پہلے بچّہ کی ماں کے لیے اس کا ذکر کرنا آسان کام نہیں ـــ

اماں پہلے بہو سے ہر وقت کام لیتی تھیں۔ دن رات ان کی خدمت کرتی۔ گھر کے کام کرتی مگر ان کا منھ سیدھا نہ ہوتا ـــ جیسے بہو نہ ہو ان کی باندی ہو ـــ کئی بار وہ ان سے الجھتے الجھتے رہ گیا ـــ ماں کی محبّت، خدمت اور احترام مانع آ جاتا۔ بچاری بوڑھی ہیں، کمزور ہیں، دکھی ہیں ـــ میرا اور میری بیوی کا فرض ہے کہ ان کی خدمت کریں۔ ان کا کہنا مانیں ـــ مگر وہ خواہ مخواہ اسے ڈانٹتی کیوں ہیں۔ مہرو کہتی تھی پھوپی اماں کا اصول ہے "بہو رانی گھر بار تیرا مگر کوٹھی کٹھلے کو ہاتھ نہ لگائیو!" وہ ہنس کر کہتی مگر جھنجھلاہٹ اس سے چھپی نہ رہ سکتی ـــ "مگر دیکھو ان کا سب کچھ ہمارا اور ہمارے بچوں ہی کا تو ہے۔ ان کا ہمارے سوا اور ہے بھی کون! بچاری باجی تو بھری جوانی میں ختم ہو گئیں ..." وہ سن لیتی۔ چپ ہو جاتی۔ خدمت اور کام بھی کرتی ـــ مگر ان کی زیادتی پر رونے بھی لگتی تھی۔ لیکن اگر کبھی وہ خود ان سے اس کی طرف داری میں کچھ کہنا چاہتا تو وہ اسے منع کر دیتی "کوئی پھوپی اماں سچ مچ مجھے نکمّا یا بد سلیقہ تھوڑا ہی سمجھتی ہیں۔ ہاں فضول خرچ کہتی ہیں ـــ وہ تو ہیں ہوں ہی ـــ مگر یہ بھی تو دیکھو سیّاں۔ تمھاری وہ ماں ہیں ـــ اور اس طرح میری پھوپی تو ہیں ہی، ماں بھی ہیں ـــ تم کچھ نہ کہنا ان سے!" اور وہ اس کا منھ دیکھ کر رہ جاتا ـــ اس زمانے میں ایسی عورتیں اور لڑکیاں عام تھیں ـــ اور آج ـــ اور آج ......

مگر جب سے ماں جی کو پتا چلا تھا کہ بہو ماں بننے والی ہے تو ان کا رویّہ ہی بدل گیا۔ ایک پیارے سے پوتے کی آرزو نے ان کی دنیا بدل ڈالی۔ بہو

کے لاڈ پیار، دیکھ بھال، چاؤ چونچلے ہر وقت ہوتے۔ ان کا بس چلتا تو وہ گود میں لیے بیٹھی رہتیں۔ مگر مہ رو کو کام کی عادت تھی۔ "نہیں پھوپی اماں۔ مجھے کھانا ہضم نہیں ہوتا ـــ یہ کام تو میں ضرور کروں گی ـــ" اب بھی وہ رات کو روزان کے پیر دباتی تھی۔ سر میں تیل ڈالتی تھی ـــ کپڑے سیتی تھی ـــ اور وہ ماں جی ہر وقت ننھے ننھے کپڑے نئے اور پرانے سیا، کاٹا کرتیں

وہ انھیں چھیڑنے کے لیے پوچھتا "ماں جی تمھاری پوتی کس کی صورت ہوگی ؟"

وہ بے سمجھے پوچھتیں "پوتی ـــ ارے کس کے ہوئی پوتی ـــ ہائے یہ پتھر کس کے گھر گرا ـــ وہ سوکھا منہ بنا کر کہتا" ابھی تو نہیں گرا ـــ میں تو تمھاری پوتی کا ذکر کر رہا ہوں ـــ کیا نام رکھوگی ماں جی اس کا۔"

وہ سوکھے دبلے کالے ہاتھ کا تھپڑا ٹھاتیں" چپ رہ۔ ماروں گی ! ـــ میرے تو چاند سا پوتا ہوگا ـــ خبر دار بد فال منہ سے نہ نکالا کر۔"

وہ ہنستا ہوا ڈرنے کی ایکٹنگ کرتا ہوا وہاں سے بھاگتا۔ پوتی ـــ پوتی۔ پوتی ـــ"

مہرو کو یہ سب اچھا نہ لگتا" کیا خدا کی باتوں میں بھی ان کا دخل ہے مجھے پھوپی اماں کی بات ذرا نہیں بھائی۔ ـــ"

" ہنھ ان کے کہنے سے کیا ہوتا ہے بیچاری ذرا جی خوش کر لیتی ہیں!"

" نہیں جی وہ ضرور ہنگامہ کریں گی اگر لڑکی ہوئی تو ـــ" اور پھر خود ہی شرما جاتی۔

" مجھے تو لڑکی ہی پسند ہے۔ بالکل اپنی ماں جیسی گول مٹول ـــ"

" ہٹو ـــ بے شرم۔"

اور پھر وہ دونوں آنے والے بچّے کے بارے میں باتیں کرتے ـــ بلکہ وہ کرتے اور بیوی سنتیں۔

"اور بچی کی خوش قسمتی نے آنے سے پہلے ہی رنگ جما لیا۔ وہ نائب

تحصیل داری کے لیے نامزد ہو گیا۔ ماں جی بڑے بھیا اور بھابی اور مہرو سب بہت خوش تھے۔ مٹھائی بٹی۔ مولود شریف ہوا۔ مولا علی کی نذر کی گئی۔ مگر جب یہ پتا چلا کہ اسے دوسرے شہر جانا پڑے گا تو ادھر ماں جی اور ادھر مہرو بہت اداس ہو گئیں۔ ماں جی جنھوں نے آج تک اسے نظر سے اوجھل نہ کیا تھا کیسے اس کے بغیر رہیں گی؟ اور مہرو اس حال میں اس کی دوری کیسے برداشت کرے گی؟ ان خیالات نے اس کو فکر مند ضرور کیا، مگر نوکر ہونے کی خوشی، آزادی ملنے کی مسرت چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔ مہ رخ نے ایک دن بہت رنج سے کہا "تم تو ایسے خوش ہو سیّاں جیسے کسی قید سے چھوٹ کر جا رہے ہو۔" اس نے بہت سمجھایا تھا، بہت دلداری کی تھی۔ پھر اس نے ایک عجیب فرمائش کی۔ یہ بات اس سے پہلے ماں جی بھی کہہ چکی تھیں۔ یہاں تک کہا تھا مرتے سمے دودھ نہ بخشوں گی اگر تو نے کبھی حرام کے پیسے کو ہاتھ لگایا۔ مگر مہرو جس کی عمر شوق کی تھی۔ جس عمر میں پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ زیور، روپیہ، گھر، سامان، کپڑا، ہر چیز کا شوق ہوتا ہے...... وہ یہ بات کیسے کہے گی!

"سیّاں قسم کھاؤ میری ایک بات مانو گے؟"

"واہ بے سوچ سمجھے، بے سنے کیسے قسم کھا لوں؟"

"نہیں میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہو جو تو کہے گی مانوں گا۔"

"میں سمجھ گیا وہ نسیم والی بات کہے گی۔"

"وہ روٹھ گئی تم قسم نہیں کھاؤ گے___؟"

"پہلے بات تو بتاؤ___"

"اب میری نہیں خدا کی قسم کھانی پڑے گی۔ مجھے تو تم جب چاہو دھوکا دے سکتے ہو___ مگر اس کو نہیں!"

"تم کہو تو کیا بات ہے؟" اس نے جھلا کر کہا۔

"رشوت نہ لینا ـــ بس جو تنخواہ ملے اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں!"

وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگے تھے!

"میں تھوڑے میں گزارہ کر لوں گی۔ تنگی ترشی سے بسر کر لوں گی ـــ تم نہیں جانتے حلال کی کمائی میں جو برکت ہے وہ حرام کے ہزاروں میں نہیں ـــ ارے رشوت کا پیسہ تو دروازے سے آتا ہے اور موری کے رستے نکل جاتا ہے ـــ"

اور اسے مہرو کی قسم کھانی پڑی تھی ـــ خدا کو حاضر ناظر جان کر کھانی پڑی تھی کہ وہ رشوت نہیں لے گا ـــ اور پھر زندگی بھر ماں اور بیوی کی یہ نصیحت اور قسم اس کے پیروں کی زنجیر رہی۔ .... کیسے کیسے وقت آئے ـــ کتنی بڑی بڑی رقمیں اسے پیش کی گئیں ـــ رشوت نہ لینے پر اس پر کتنے جھوٹے الزام بڑے افسروں اور چھوٹے ماتحت لوگوں، سبھی نے لگائے مگر اسے اپنی قسم کا پاس تھا اور اب تو اپنی عزت کا پاس بھی ہو گیا تھا ـــ خدا نے اس تھوڑے میں برکت دی ـــ نائب تحصیل دار سے تحصیل دار ہوا۔ اور آخر میں سال بھر ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز رہ کر پنشن پائی ـــ سب لوگوں میں اس کی عزت تھی۔ اس کا مان تھا ـــ اور یہ ـــ یہ غربت بھی اسی کی بدولت تھی جس نے تنگی میں شکوہ نہیں کیا۔ فراغت میں غرور نہیں کیا ـــ بس ایک میانہ چال تھی جس پر چلتی رہی!

مہرو نے اس کے جانے سے پہلے ایک دن فرمائش کی "میاں اب تو تم جا رہے ہو کئی مہینے کو ـــ ہمیں چلتی پھرتی تصویریں دکھا دو۔ تم نے وعدہ کیا تھا مگر بھول گئے!"

کام تو مشکل تھا۔ ایک تو ماں جی اتنی آزادی کے خلاف اور پھر "اس حال میں" تو وہ اسے پھونک کر قدم رکھنے دیتی تھیں۔ مگر اتنے لاڈ سے، اتنے ناز سے کی ہوئی فرمائش وہ ٹال نہ سکا۔ آخر دونوں نے

سازش کی۔ مہرو کی اماں کئی دن سے بلا رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے ماں جی نے اجازت دی اور وہاں جانے کے بجائے بائسکوپ دیکھنے پہنچ گئے۔ ایک زنانہ درجہ ہوتا تھا اس میں مہرو کو بٹھایا۔ بالکل اس سے مل کر باہر کی سیٹ پر وہ خود بیٹھ گئے۔ کس قدر خراب سینما ہاؤس ہوتے تھے اس وقت پورے وقت خوانچے والے شور مچاتے رہتے، بچے گندگی کرتے۔ عورتیں اور مرد کھانے کے دونے اور مونگ پھلی اور پھلوں کے چھلکے پھیلاتے رہتے۔ لڑائیاں ہوا کرتیں! خاص کر زنانہ درجے میں۔ مہرو کی بھی کسی سے ٹھن گئی۔ بچے روئے چلے جا رہے تھے، مائیں چلا رہی تھیں۔ مگر مہرو نے پہلی مرتبہ یہ "جادو کا کھیل" دیکھا تھا اور وہ اس میں ذرا سی رکاوٹ برداشت نہ کر سکتی تھی۔ وہ بھی تالی بجاتی، کبھی زور زور سے ہنستی۔ کبھی جھک کر پوچھتی ــ سیاں یہ کیا ہوا؟ یہ کیسے ہو گیا ــ پھر لڑائی ہو گئی ـــــ ارے بچوں کو لے کر کیوں آتی ہو ـــ ٹھیک سے دیکھنے بھی نہیں دیتیں۔! بھلا بچے والیوں کو یہ کہاں گوارا کہ کوئی ان کو ٹوکے" اے ہے بڑی شوقینی ہے۔ مالوم ہو ہے ابھی نگوڑی ناٹھی ہے۔ جب بچہ ہو گا تو دیکھیں گے کہاں پھبنک آوے گی۔" باہر سے وہ مہرو کو سمجھا رہا تھا، دوسرے مرد اپنی عورتوں کو ڈانٹ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے ہنگامہ تھا مگر بڑبڑاہٹ کی آوازیں آتی رہیں۔

پھر بھی وہ باہر نکلی تو خوشی سے بے حال تھی۔ "سیاں اب ہم ہر مہینے یہ تماشا دیکھا کریں گے ـــــ" راستے بھر عجیب عجیب تبصرے کرتی رہی۔ اور وہ ہنستا رہا۔ پہلی بار دونوں باہر اکٹھے گئے تھے۔ کسی دوکان سے لے کر آلو پوری کھائی۔ قلفی کھائی۔ وہ پوری آستین کا کالا برقع، دہری نقاب پاؤں میں موزے پہنے ہوئے تھی ـــ اس کی جھلک بھی وہ نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ پھر بھی دونوں بہت خوش تھے۔ اب فلم اور سینما ہاؤسوں نے کتنی ترقی کر لی ہے۔ ان دونوں نے ہندستان میں اور باہر بھی کتنی فلمیں دیکھی ہیں

ایک سے ایک اعلیٰ درجے کی۔ مگر جو خوشی اس پھٹیچر سینما ہاؤس اور گھٹیا سی فلم دیکھ کر ہوئی تھی اس کی بات ہی اور تھی۔ رات گئے وہ مہرو کی ماں کے پاس پہنچے اور ان کو بتا دیا وہ بچاری تو بڑی نیک اور سیدھی بیوی تھیں"۔ "ارے تو میاں بیوی ہی تو ساتھ گئے تھے ۔۔۔ مگر بٹیا اس حال میں ذرا احتیاط کرنی چاہیے!"

مگر جانے کس مخبر نے ماں جی کو خبر دے دی۔ افوہ۔ طوفان آگیا۔ ایک تو یہ "آزادی" یہ بے راہ روی" کہ میں بیوی کے ساتھ "چلتی پھرتی تصویریں" دیکھنے گیا۔ بے حیائی، کی حد ہے؟ اور پھر ماں جی سے چھپ کر کوئی کام کرنا۔ مجھ سے کہیں زیادہ غصہ اور طنز و طعن کا شکار تو مہرو ہوئی۔ کئی دن روتی رہی پھر ان کو فکر یہ تھی کہ پیر اونچا نیچا نہ پڑ گیا ہو ۔۔۔ بہر حال یہ طوفان جب تھا، جب میرے جانے کی تیاری شروع ہوئی۔ آج کل کے نوجوان یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم لوگ کیا کچھ جھیلتے تھے۔ اور منہ سے اُف نہ کرتے تھے۔ ماں باپ اور بزرگوں کا کیا درجہ ہے ۔۔۔ یہ جانتے تھے نا ۔۔۔ پھر بھلا جو لوگ ماں باپ کی پروا نہیں کرتے وہ ساس سسر کی باتیں سننے اور سختیاں جھیلنے والی کو احمق ہی تو سمجھیں گے!

عالیہ اندر آئی اور آہستہ سے بولی۔" پھوپا ابا ۔۔۔ نسیم خالہ نے یہ خط دیا تھا ۔۔۔ وہ بیچاری آ نہیں سکیں۔ ان کو بھی تو دل کی بیماری ہو گئی ہے"۔

ان کے ہاتھ کانپنے لگے۔ شاید اڑتالیس برس بعد آج نسیم کا خط ان کے ہاتھ میں آیا تھا ۔۔۔ نسیم نے کیا لکھا ہو گا؟" یہ سوچ کر وہ گھبرا سے گئے بڑی دیر بعد لفافہ کھولا۔ شروع میں تعزیت کے وہی سب فرسودہ الفاظ تھے۔ بندھے ٹکے جن میں کوئی درد یا خلوص نہیں ہوتا ۔۔۔ مگر آخری جملہ ان کے دل میں نشتر کی طرح چبھ گیا"۔ ۔۔۔۔ میں نے اسے معاف کیا ۔۔۔ مرنے والے سے کیا دشمنی ۔۔۔ مگر تمھیں ۔۔۔ تمھیں کبھی معاف نہیں کروں گی ۔۔۔ اب

شاید تم جانو گے کہ فراق کی آگ کیا ہوتی ہے ــــ"

فراق ــــ وصال ــــ دل کی بیماری ــــ مہرو ــــ نسیم ــــ سہیل میاں ــــ یہ زندگی ــــ یہ زندگی کا مزاق!

نسیم دِل کی بیماری میں بتلا ہے۔ عمر بھر اس دِل نے اسے ستایا۔ اور اب تک ــــ وہ ــــ اور وہ خود بیوی کے ساتھ چین آرام کی زندگی بسر کرتا رہا ــــ آج نسیم ایک خواب ہے ــــ ایک بھولی ہوئی ہستی ــــ زنگ خوردہ وجود ــــ دنیا کی ٹھکرائی معذور مجبور بڑھیا ــــ کیا تھی وہ دنیا کی حسین ترین عورت ــــ شعلہ جوالہ ــــ تڑپتی ہوئی بجلی ــــ سراپا عشق ــــ سراپا محبّت! اور پھر ــــ پھر ــــ سراپا نفرت!

ان سے یہاں بیٹھا نہ گیا۔ سردی سے ہاتھ پاؤں یخ ہو چکے تھے۔ وہ آہستہ سے اٹھے، باہر نکلے اور اپنے کمرے میں جا کر تخت پر گر پڑے۔ دوسرے کمرے میں پڑی ہوئی مہرو کی میت، گھر میں ہوتے ہوئے کاروبار، آنے والوں کا انتظار ــــ وہ سب بھول چکے تھے اور پوری طرح کل ــــ کل میں کھو گئے۔

---

(۸)

پوسٹنگ ہوئی تو اس شہر میں جہاں نسیم اپنے خاندان کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک پرانے دوست کے ذریعے اس کا گھر بھی معلوم ہو گیا۔ سوئی محبت جاگ گئی۔ بس وہ ایک بار نسیم سے مل کر اپنی صفائی دے دیں۔ اسے بتا دیں کہ وہ مجبور کر دیا گیا تھا۔ اسے اپنی محبت کا یقین دلا دیں ـــــ اور کچھ نہیں ـــــ اس وقت ان کا خلوص سے یہی خیال تھا۔

مگر جب ملاقات ہوئی تو وہ سب کچھ بھول گئے۔ دو چار دفعہ تو نسیم اس سے ملی ہی نہیں۔ اس کے سات آٹھ بہن بھائی، بیمار اور بوڑھے باپ اور پھٹے حال رہنے والی ماں ہی سے مل کر چلے آئے۔ اب اسے اندازہ ہوا کہ امی جان نے اسے کیوں اپنے پاس بلا لیا تھا۔ ہائے ـــــ نسیم جیسی حسینہ اور اس ماحول میں پڑی سڑ رہی ہے اور وہ بھی کس کی وجہ سے؟ ماں باپ پر اتنے بچوں کا بار کیا کم تھا کہ وہ نسیم جیسی نفاست پسند اور شوقین مزاج لڑکی کو رکھ سکتے۔

پھر ایک دن وہ بے آواز دیے گھر میں گھس گیا۔ نسیم سامنے بیٹھی

جھوٹے بھائی کو کھانا کھلا رہی تھی۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اس کے ماتھے پر تین بل ابھر آئے۔ اور اس نے منہ پھیر لیا۔

"خالہ جان کیا نسیم مجھ سے خفا ہیں؟" خدا جانے اتنی ہمت اس وقت کہاں سے آ گئی تھی۔ خالہ جان مسکرائیں۔ "پوچھ لو۔ بیٹھی تو ہے۔"

"نسیم ... نسیم"

اس نے ترچھی نظروں سے دیکھا۔ آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ بکھرے الجھے سنہری بالوں کی لٹیں چوڑے ماتھے پر جھک آئی تھیں وہ اٹھی اور بغیر ایک لفظ کہے اندر کوٹھری میں چلی گئی اس نے دیکھا اس کے کپڑے میلے اور پرانے ہیں۔ چہرہ پر نہ سرخی ہے نہ پوڈر۔ نہ جسم پر کوئی زیور ہے اور نہ اب وہ کافر شباب۔ ہمیشہ نک سے سک تک سجی بنی ریشمی کپڑوں میں ہنستی، شوخ فقرے کستی، نسیم اسے اپنے سے بہت اونچی محسوس ہوتی تھی۔ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ اور مہر وکی محبت، اس کی تعریف و تحسین، اس کو اپنا دیوتا سمجھنا۔ اس کی انا کو بڑی تسکین بخشتا تھا۔

مگر یہ سوگوار حسن، غریبی کا گہنایا ہوا چاند۔ دل میں دردِ محبت کی ایک تیز لہر اٹھی۔ خالہ جان باورچی خانہ میں تھیں۔ بچوں کی اسے پروا نہ تھی وہ لپک کر کوٹھری میں گھس گیا۔ نسیم ایک پلنگ پر اوندھی پڑی سسکیاں لے رہی تھی۔

"نسیم ــــ خدا کے واسطے نسیم روؤ نہیں ــــ مجھے دو باتیں کرنے کا موقع دو۔"

اس نے سر اٹھایا۔ آنسوؤں سے بھیگی آنکھیں اس کا دل کھینچ رہی تھیں ــــ "کیوں؟ تم آخر مجھ سے کیوں بات کرنا چاہتے ہو؟"

"میری بات سن تو لو۔" وہ گڑبڑایا۔ مگر نسیم کا غصہ اسی طرح تھا

"کیا فائدہ ہے ان باتوں سے؟"

"نہیں مجھے تو ہے۔ میرے دل پر جو بھاری بوجھ ہے وہ اتر جائے گا نسیم پیاری۔"

"خبردار ـــــ پیاری ہوگی وہ تمہاری چہیتی۔ آئندہ مجھ سے اس قسم کی باتیں کیں تو اچھا نہ ہوگا ـــ" اور وہ تیزی سے اٹھ کر گھر کے کسی اور حصّے میں چلی گئی اور وہ کھسیانا ہوا، افسردہ سر جھکائے چلا آیا۔ پھر کئی دن تک وہ وہاں نہیں گیا۔ نسیم کے برتاؤ نے اس کا دل توڑ دیا تھا۔ ٹھیک ہے اب اسے کیا حق ہے کہ وہ اس سے اظہارِ محبت کرے۔ وہ ہنسی خوشی ازدواجی زندگی گزار رہا ہے۔ اور وہ اس نرک میں پڑی ہے، نسیم کا غصّہ بجا ہے۔ اسے وہاں نہیں جانا چاہیے۔ مگر پھر۔ ایک دن نسیم کے دس گیارہ سال کا بھائی، دبلا پتلا، میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے، ایک کندھے پر بستہ لٹکا ہوا اس کے پاس آیا ـــ "سہیل بھیا ـــ" وہ اچک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ کیا ہے بیٹا۔ کیسے آئے؟" اس نے ایک خط اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"آپا نے دیا ہے ـــ اور ماں اور ہم سب آپ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔"

وہ روکتا رہ گیا۔ مگر لڑکا بھاگ گیا۔ اسکول کو دیر ہو رہی ہے۔

اس نے لفافہ کھولا۔ پرانا سا سفید لفافہ۔ اس میں عطر کی بھینی بھینی وہ خوشبو نہ تھی۔ وہ رنگین پھول دار کاغذ نہ تھا۔ مگر کاپی کے پھٹے ہوئے صفحے پر تحریر وہی موتیوں کی لڑی جیسی تھی۔

"سلّو ـــ اتنا غصّہ! کس پر؟ ایک مظلوم لڑکی پر۔ کیا اب گھر نہ آؤ گے؟ صورت نہ دکھاؤ گے۔ جانتی ہوں تم اب میرے نہیں۔ میرا کوئی حق نہیں تم پر۔ مگر اتنے قریب ہوتے ہوئے تمھیں نہ دیکھ سکوں؟ اف سلّو اتنی بڑی سزا تو نہ دو ـــ بس اور کچھ نہیں چاہتی۔ چاہ کر کے بھی کیا لیا۔ صرف کبھی کبھی

تمھیں دیکھ لینا ہی زندگی کی سب سے بڑی اور سب سے مشکل آرزو رہ گئی ہے۔

وہ تم کبھی جس کے تھے"

اس خط کو ہاتھ میں لیے وہ کتنی دیر کھڑا رہا اور آنسو بہہ بہہ کر کاغذ کو گیلا کرتے رہے۔ کتنا مجبور اور بے بس ہے وہ! شام کو وہ سیدھا نسیم کے گھر پہنچا۔ وہ سامنے دالان میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہی دلکش مسکراہٹ جو سیدھی دل میں اتر جاتی ہے۔ کپڑے صاف تھے۔ بالوں میں کنگھی کر کے خاص انداز سے ماتھے پر پتے سے بنا دیے گئے تھے۔ ہونٹوں پر سرخی بھی تھی۔ "آؤ سہیل" منہ سے اس نے اتنا ہی کہا مگر اس کی آنکھوں نے اس کے انداز نے بہت کچھ کہہ ڈالا۔

اور پھر ہوا کی طرح دن اڑنے لگے۔ نسیم کی ماں یا تو بہت بھولی تھیں یا بہت چالاک۔ یا شاید بیٹی سے ڈرتی ہوں۔ وہ قریب قریب اس کی ہم عمر تھی اور اب تک بیاہ نہ ہوا تھا۔ غریب تھی نا۔ یا خدا جانے نسیم ہی انکار کر دیتی ہو ... وہ جانا تو ادھر ادھر ہو جاتیں۔ پھر وہ سیر و تفریح کے بہانے نسیم کو باہر لے جانے لگا۔ ہاں اس کی ماں اتنا ضرور کرتیں کہ دس سالہ ننجو کو ساتھ کر دیتی تھیں۔ بچاری یہ نہیں جانتی تھیں کہ اتنے سے لڑکے کو نفرہ دینا کون سا مشکل کام ہے۔ خود نسیم ہی اس کے ہاتھ پر پیسے رکھ کر کہتی ننجو جاؤ مٹھائی یا پتنگ لے لینا ــــ اور کھیل کود کر آجانا ہم تمھارے ساتھ واپس چلوں گی۔

پھر وہ گھنٹوں یا تو گھر میں بیٹھ کر باتیں کرتے یا فلم دیکھنے چلے جاتے یہ خاصا بڑا شہر تھا۔ فلم ہاؤس کئی تھے۔ فلمیں بھی اچھی آتی تھیں۔ اور پھر نسیم کس قدر انجوائے کرتی تھی فلموں کو، اس کے ذہین ریمارکس، دلچسپ فقرے، ہیرو، ہیروئن کی محبت پر تبصرے اور پھر بر محل میں

میں چھپا سر اس کے کندھے پر جھکا کر اور اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبا کر حسرت سے کہتی "آؤ سلو ہم بھی کسی ایسی نگری میں چلیں . . " وہ اکثر فلمی گانے گنگنایا کرتی۔ کتنی پیاری آواز تھی۔ کبھی فقرے کستی ـــــ سلّو تمہاری بیوی تو بہت پڑھی لکھی ہے نا؟ قرآن شریف۔ مسئلے مسائل کی کتابیں مراۃ العروس سبھی پڑھی ہوں گی۔ اسے کچھ برا لگتا ـــــ میری بیوی تمہاری جیسی قابل تو نہیں۔ بھلا شاعروں کے وہ دیوان اور مثنویاں، ناول نگاروں کی وہ کتابیں اسے پڑھنے کو کہاں ملتیں جو تم نے پڑھی ہیں۔ مگر پھر بھی تم اسے جاہل نہیں کہہ سکتیں اور اسے خیال آتا کہ مہ رخ ایسی جاہل تو نہیں۔ اس نے بھی مڈل تک پڑھا ہے۔ کتابیں پڑھنے کا شوق بھی ہے۔ ایک چھوٹی سی الماری میں اس کے شوق کی کتابیں سلیقے سے چنی رہتی ہیں۔ ہاں ان میں مراۃ العروس بھی ہے اور بنات النعش بھی۔ گودڑ کا لال بھی ہے اور شوکت آرا بیگم، زہرہ بیگم، حرماں نصیب، اختری بیگم، اور شریف زادہ بھی ہے، انیس و دبیر کے مرثیے بھی۔ شوکت کے نوحے بھی۔ اختر شیرانی کا کلام بھی ہے اور حفیظ جالندھری کی شاہنامہ اسلام بھی اور ان کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ بھی۔ مسدس حالی، بیوہ کی مناجات، چپ کی داد اور دیوانِ حالی بھی اس کی کتابوں میں موجود ہے۔ اور غالب کا دیوان بھی ہے ـــــ مگر ـــــ غالب کا دیوان ـــــ خود اس کی سمجھ میں نہیں آتا پھر وہ کیا سمجھتی ہو گی؟

"کہاں کھو گئے ـــــ بیوی بری طرح یاد آگئی یا برا مان گئے ـــ"

اور پھر اس نے دو تین پھڑکتے ہوئے شعر پڑھے، اس کی یادداشت اتنی اچھی تھی کہ فسانہ آزاد کے مکالمے، امراؤ جان ادا کا قصہ، شرر کے ناولوں کے کردار سب یاد رہتے تھے۔ دربارِ حرام پور، اور حسن کا ڈاکو جیسی کتابیں تک اس نے پڑھی تھیں۔

وہ اس کی صحبت میں سب کچھ بھولتا جا رہا تھا ـــ ماں جی کا خوف ـــ

ابا جانی کا غصہ ــــ مہرو کی محبت، ــــ ہونے والے بچے کا پیار ــــ سب نسیم کی نشہ آور محبت اور دلکش شخصیت میں ڈوب گئے تھے۔ اسے ڈیڑھ سو روپے کے قریب ملتے تھے۔ اس زمانہ میں اتنے روپے بہت ہوتے تھے۔ مگر وہ گھر میں یہی لکھتا رہا بہت مہنگا شہر ہے ــــ خرچ پورا نہیں پڑتا ــــ اور خط بھی کبھی کبھار ہی لکھتا۔ شروع میں آٹھویں دسویں دن مہرو کا خط آتا تھا۔ وہ جواب بھی دیتا رہا ــــ پھر جواب دینا بھولنے لگا ــــ خط کھول کر پڑھنا بند کر دیا ــــ یہ خیال بھی نہ آتا کہ اتنی مدت گزر گئی مہرو کا خط کیوں نہ آیا؟ اس کی طبیعت کیسی رہتی ہے؟ ایک دن اسے بڑی بھابی کا خط ملا۔ انھوں نے بہت ملامت کی تھی۔ نصیحت فضیحت کی تھی۔ تم بھی اپنے بڑے بھیا کے رنگ پر جا رہے سلّو؟ کیا اس معصوم لڑکی کو بھی میری طرح رونا پڑے گا عمر بھر۔ تمھیں یہ خیال نہیں آتا کہ وہ تمھاری بچے کی ماں بننے والی ہے۔ پہلی بار ماں بننا، تم مرد کیا جانو، کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ اسے خوش رکھنے کی ضرورت ہے۔ اور تم نے اسے آٹھ آٹھ آنسو رلا رکھا ہے۔ سلّو خدا کے لیے مہ رخ کو ایک بار آکر دیکھو تو...

اس کا دل مسل اٹھا۔ ضمیر ملامت کرنے لگا۔ وہ کیا کر رہا ہے؟ کدھر جا رہا ہے؟ کیا وہ نسیم سے دوسری شادی کرے گا؟ نہیں! باجان کا حال اُس کے سامنے تھا۔ ماں کا دکھ زندگی بھر دیکھتا رہا تھا۔ وہ ابھی بڑی بھابی کو خط لکھے گا ــــ مہرو کو لکھے گا.....

شام کو نسیم آگئی۔ اسی طرح شگفتہ گلاب کی طرح کھلی ہوئی ــــ اٹھلاتی۔ مسکراتی۔ آتے ہی اس کے گلے میں جھول گئی۔ اونھ سلو ــــ کب سے کہہ رہے ہیں کہ ذرا آگرے کی سیر کرا لائیے ــــ دور ہی کتنا ہے۔ مگر تم۔ جاؤ ہم نہیں بولتے ــــ"

اور وہ سب کچھ بھول گیا۔ آگرہ جانے کا خود اسے بہت شوق تھا

مگر ماں جی نے تو اسے بھورے میں پالا تھا۔ کئی بار اس کے دوست آگرہ گئے۔ اختر علی کی تو سسرال ہی آگرہ کی تھی۔ مگر ماں اسے جانے کب دیتی تھیں۔

آخر ایک دن آگرہ کا پروگرام بن ہی گیا۔ تین دن کی چھٹیاں آرہی تھیں۔ نسیم نے جانے کس طرح ماں باپ سے اجازت لے لی تھی ــــ باپ تو خیر بچارے معذور ہی تھے ــــ شاید پتا بھی نہ چلتا تھا کہ کون کہاں گیا البتہ نسیم کی بہنوں سے نبٹنا مشکل ہو گیا۔ وہ دونوں جوان تھیں۔ قبول صورت تھیں۔ نسیم جیسی ذہین اور حسین تو نہ تھیں مگر آخر سمجھتی تو سب ہوں گی۔ دونوں نے ضد کی" سہیل بھیّا ہم بھی چلیں گے۔" اس نے نسیم کو دیکھا وہ جھڑک کر بولی" تم وہاں کیا کروگی؟" بڑی نے چیخ کر جواب دیا" اور تم کیا کروگی؟" چھوٹی نے آنکھیں نچائیں۔" اری ہماری اور ان کی برابری کیا۔ یہ ٹھہریں ممتاز محل ــــ سیر کریں گی ــــ سہیل بھیا.... آپ ہی جائیے ــــ ہمیں ضرورت نہیں۔"

عجب بدمزگی ہو گئی۔ مگر اگلے دن وہ نسیم کے ساتھ آگرہ روانہ ہو گیا نسیم کی ماں نے نجّو کو ساتھ کر دیا تھا اور اگلے دن آنے کا وعدہ کر لیا تھا ان دونوں نے۔

انھیں آگرہ کی سیر کا وہ پرانا واقعہ کیسے اس وقت ساری جزئیات کے ساتھ یاد آرہا ہے؟ نسیم کے ساتھ آگرہ کی وہ سیریں ــــ تاج محل کا دن کی روشنی اور رات کو چاندنی میں گھنٹوں نظارہ! گھومنا، پھرنا فتحپوری کی سیریں۔ وہ تھا۔ اس کی ممتاز محل تھی۔ اور بس ساری دنیا ہیچ تھی اس وقت! چار دن تک وہ آگرہ میں رہے۔ اب تک ان کی محبت ایک خاص دائرے کے اندر رہی تھی۔ جسے آج کل کی زبان میں فلرٹیشن کہا جاتا ہے مگر اس چار دن کے دن، رات کے قرب نے انھیں لڑکھڑا دیا۔ نسیم کی خودسپردگی اور بے پناہ

اظہارِ محبّت اور اس کا حسن و شباب۔ وہ بہک گیا۔ سب کچھ بھول گیا۔ مہرو کا کیا حال ہوگا۔؟ ماں جی زہر نہ کھالیں گی؟ اور تو اور مذہب، خدا کا خوف۔ دنیا کی شرم سب بھول گیا۔ یاد تھی تو بس نسیم۔ مرد کے لیے پہاڑوں کی اونچی چوٹیاں سر کرنا آسان ہے، سمندر کے جگر کو چیر کر پار کرنا سہل ہے، اپنے سے دگنے طاقت ور دشمن کو زیر کرنا بھی مشکل نہیں ــــ مگر نفس کا منہ زور گھوڑا جب سرپٹ دوڑتا ہے تو بڑے سے بڑے شہ سوار کو چت کر دیتا ہے وہ بہک گیا، خدا رسول، وفا، محبت، مذہبی قدریں کیسے ان سب کو بھول گیا تھا ــــ کیا یہ صرف نسیم کا قصور تھا؟ وہ اسے اسی طرح جکڑ لینا چاہتی تھی کہ وہ ہل نہ سکے۔ ابا جانی کی طرح وہ بھی دوسری شادی رچالے۔ مہرو کو چھوڑ دے ــــ برسوں وہ یہ دھوکا اپنے کو دیتا رہا تھا کہ سارا قصور نسیم کا تھا ــــ جب تک عورت خود بری نہ ہو کوئی مرد اسے بہکا نہیں سکتا ــــ عورت خود ہی گلے پڑ جائے تو مرد بچارا کیا کر سکتا ہے؟

ہاں برسوں اپنے کو اس دھوکے میں رکھا اس نے۔ مرد کی یہ بھی فطرت ہے کہ وہ عورت کی ہر گراوٹ، ہر عیب کا ذمہ دار اس کو ٹھہرا دیتا ہے اور اپنے ضمیر کو تھپک کر سلا دیا کرتا ہے۔ مگر عمر کی اس منزل میں ــــ جب اس عادل کی عدالت میں پیش آنے کا وقت اتنا قریب ہے اس حقیقت کو وہ کیسے جھٹلا سکتا ہے کہ یہ سب خود فریبی تھی۔ نفس کا دھوکا تھا۔ کسی بڑے مفکّر نے لکھا ہے کہ عورت کبھی بری نہیں ہو سکتی جب تک مرد اسے برے کام کی طرف راغب یا مجبور نہ کرے۔ جب کبھی عورت کو نفس کی خواہشوں کے سامنے جھکتا پاؤ گے اس میں کسی مرد کا ہاتھ ضرور ہو گا ــــ آہ ــــ آج محسوس ہو رہا ہے کہ یہ سب سچ ہے۔ قصور نسیم کا نہیں، خود اس کا تھا!

مگر اس وقت تو وہ بے پیے مدہوش تھا۔ بس نہ تھا کہ نسیم کے لیے کیا کر دے۔ کتنی چیزیں اس کو خرید کر دیں۔ کپڑے، زیور، آرائشی سامان

کبھی کبھی نفس ٹھوکا دیتا۔ مہرو کی یاد آجاتی۔ اس کے لیے اس نے آج تک کچھ خرید کر نہیں بھیجا۔ مگر نئے ریشمی برقعے کی جالی میں سے جھکتی نسیم کی شرارتی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں ـــــ اور وہ پھر کوئی نئی چیز خرید کر اسے پیش کر دیتا۔ اس کے گھر والوں کے لیے پیٹھے کی مٹھائی، دال موٹھ نجو کے لیے نیکر، قمیص، گیند بلا۔ اور نسیم کے لیے آخری تحفہ ننھا سا ایک تاج محل!

خدا جانے وہاں کیا گزری۔ نسیم نے کیسے گھر والوں کی خفگی کا مقابلہ کیا۔ ہاں یہ اندازہ اسے ہوگیا کہ اس نے ماں کو یقین دلایا ہے کہ اب وہ جلد اس سے بیاہ کرنے والا ہے۔

میں جاتا تو بہنوں کی آنکھوں میں رشک اور نظر آتا، ماں کے انداز میں سرد مہری بھی تھی اور ساتھ ہی گھوم پھر کر نسیم کی شادی کے تذکرے بھی۔ اب جلدی بیاہ ہونا چاہیے۔ خیر سے اب عمر بہت ہوگئی ہے!

نشہ ابھی اترا نہ تھا۔ خمار کی سی کیفیت تھی ـــــ مگر ایک خوف ـــــ ایک الجھن پیدا ہونے لگی تھی ـــــ کیا ہوگا؟ کیا کروں گا؟ اور پھر بڑے بھیا کا تار ایک بم کے گولے کی طرح گرا۔

"تمھاری بیوی اسپتال میں ہے۔ حالت نازک ہے۔ فوراً آؤ۔"

پہنچا تو سارا گھر زنانہ اسپتال میں تھا۔ مہرو کی ماں، بہن، بھائی اور جانے کتنے عزیز تھے۔ ماں جی، بھابی اور بڑے بھیا ـــــ اباجانی تک موجود تھے۔ سب پریشان تھے۔ ماں جی دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ ممانی نے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا۔

ہر آنکھ میں ملامت تھی۔ ہر چہرے پر حقارت تھی۔ بڑی بھابی نے آہستہ سے بتایا کہ "بچہ پیٹ میں مرگیا ہے۔ دلھن کی جان بچ جائے بس اب تو یہی دعا ہے ـــــ"

ماں جی نے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ سلام کا جواب نہیں دیا۔ ابا جان نے غصے سے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔۔۔۔ اور ممانی بس روئے جا رہی تھیں اور مہرو کے بہن بھائی بدحواس گھوم رہے تھے۔

دو دن سخت مایوسی میں گزرے۔۔۔۔ آخر بچے کی بھینٹ لے کر ماں کی جان بچ گئی مگر وہ اتنی کمزور تھی کہ کسی کو ملنے کی اجازت نہ تھی۔ اسے خاص طور پر روک دیا گیا تھا۔ بس بڑی بھابی اور مہرو کی بھاوج اس کے پاس رہتی تھیں۔۔۔۔

ایک بار گھر پر اس نے ماں جی سے کچھ کہنا چاہا۔ انھوں نے منھ پھیر کر ایک تیر چھوڑا۔۔۔ "بچہ مر گیا۔ کلیجے میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ بہو بھی مر جاتی تو اور خوش ہوتا۔۔۔۔ اب کیوں آیا ہے۔۔۔ وہیں جا۔۔۔ ماں اور بیوی مر گئیں تیرے لیے۔۔۔"

وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ بچہ کا غم، بیوی کی جان کا خطرہ، ماں کی حالت کا دکھ، پشیمانی، پریشانی۔۔۔ خدایا۔۔۔ مہرو کو بچا لے۔۔۔ میرے گناہ کی سزا اسے نہ ملے بس اس کا دل یہی جملہ دہرا رہا تھا۔

پھر اس کو اجازت مل گئی اور وہ پندرہ بیس دن تک مہرو کی تیمار داری کرتا رہا۔۔۔۔ اس وقت نسیم کو ذہن دماغ سب نے فراموش کر دیا تھا۔۔۔۔ مہرو بچ جائے۔۔۔ ورنہ۔۔۔ ورنہ۔۔۔ اور اس سے زیادہ سوچنے کی اس میں طاقت نہ تھی۔ وہ آنکھیں بند کر لیتی، آنسو لڑھک لڑھک کر تکیے میں جذب ہوتے رہتے اور اس کی ہمت نہ پڑتی کہ بڑھ کر انھیں پونچھ دے۔

پھر دھیرے دھیرے اس کے چہرے کی سختی کم ہونے لگی۔۔۔۔ وہ اس کو نظر چرا کر دیکھتی۔۔۔ ایک آہ سینے سے نکلتی اور پھر منھ پھیر لیتی۔

جس دن اسپتال سے چھٹی ملنے والی تھی۔۔۔ سب لوگ گھر گئے ہوئے تھے۔ وہ دونوں اکیلے تھے۔۔۔ اس نے ہمت کر کے مہرو کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

"مہرو۔۔۔ مہ۔۔۔ رُخ۔۔۔"

"سبّیاں"۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ آنکھیں بھر آئیں۔ گلا رندھ گیا۔

"سبّیاں"۔ ہمارا بچہ ——" اور پھر جو وہ اس سے لپٹ کر روئی ہے تو لگتا تھا وہ دونوں آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ جائیں گے —— وہ اسے لپٹائے اس کے سر کو آنسوؤں سے بھگوتا رہا۔ اور وہ موتی رولتی رہی۔

اور پھر اس کی باہیں ڈھیلی پڑ گئیں —— وہ بے ہوش تھی!

مگر کبھی اس نے اس زمانے کا ذکر نہیں کیا۔ جدائی، رکھائی، بے تعلقی کی باز پرس نہ کی —— یوں زندگی بھر فقرے کستی رہی۔ اور طنز کرتی رہی مگر ایسا طنز جس میں زہر نہیں ہوتا اپنا پن ہوتا ہے —— ایسے فقرے جو صرف اس پر کسے جاتے ہیں جو بہت چہیتا ہو —— جس پر اعتماد ہو!

بڑے بھیا نے کوشش کر کے تبادلہ دوسرے شہر کا کرا دیا۔ وہ چھوٹا قصبہ تھا۔ بھتّہ کم تھا —— مگر وہ بول ہی کیا سکتا تھا۔ ایک دن ماں جی نے کہا (وہ بہت کم مجھ سے مخاطب ہوتی تھیں) "بہو سا تھ جائے گی"

"ماں جی ابھی تو میرے رہنے کا ٹھکانا بھی نہیں —— گھر درٹھیک کر کے۔"

"اچھا اچھا —— پندرہ دن میں آ کر اسے لے جائیو!"

"ماں جی تم بھی تو آؤ گی ——"

"نہیں میں کہیں نہیں جاؤں گی ——"

"مگر میں تمھیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا ——"

"کیوں؟ کیا مر رہی ہوں —— بے غیرت زندگی ہے۔ مرنے کیوں لگی۔"

"نہیں ماں جی تم نہیں آؤ گی تو میں نہ گھر لوں گا نہ مہ رخ کو بلاؤں گا۔"

"کیا مہر نہ مہر رکھ رہے ہے —— شرم نہیں آتی نام لیتے؟"

"تو پھر کیا کہوں؟"

"تیرے باوا نے کبھی میرا نام نہیں لیا۔ ہمیشہ ستّو کی ماں کہہ کر پکارا۔"

میں ہنس پڑا" تو میں کس کی ماں کہہ کر پکاروں ـــــ اور پھر میری نظر ماں جی پر پڑی جو سسک سسک کر رو رہی تھیں ... مجھے یاد آگیا کہ میرا بچہ تو دنیا میں آنے سے پہلے ہی چل بسا.....

میں نے ماں جی کی گود میں سر ڈال دیا۔ اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ـــــ ماں جی مجھے یوں کلیجے سے لگائی تھیں۔ جیسے دل کے اندر چھپا لیں گی۔

اور اسی دن دل پر رکھا بھاری بوجھ ہٹ گیا۔

---

(۸)

گھر مل گیا۔ ماں جی، مہرو اور رحیمن بوا میرے پاس آگئیں۔ مہرو نے گھر سنبھال لیا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ بیٹھنے کا سجایا۔ دو کرسیاں۔ ایک صوفہ ـــــ ایک گول کشمیری میز ـــــ ایک طرف رنگین پایوں کے پلنگ پر خوب صورت چھپا ہوا پلنگ پوش۔ دیوار پر تصویریں۔ کارنس پر سجانے کی چیزیں۔ ابا جانی کی، میری، ماموں جان کی تصویریں۔ سونے کے لیے ہمارا کمرہ اور بھی خوب صورت تھا۔ ماں جی کو برآمدہ زیادہ پسند تھا کمرے میں دم گھٹتا تھا۔ مگر رات کو رحیمن اور وہ کمرے میں سوتی تھیں۔ ہمارے وطن کے گھر کتنے بڑے بڑے تھے۔ وسیع صحن، لمبے چوڑے برآمدے ـــــ صحنچیاں ـــــ ایک درے ـــــ اوپر کھلی چھتیں یہ چھوٹا سا کوارٹر تھا ـــــ مگر مہرو کے سلیقے اور شوق نے اس کو بڑا دلکش بنا دیا تھا ـــــ

گھر کا خرچ اب مہرو کے ہاتھ میں تھا۔ خود ماں جی نے کہا اب تم اپنا گھر بار سنبھالو ـــــ میں آج ہوں۔ کل نہیں ـــــ وہ ان سے پوچھ کر کھانا پکاتی ہر طرح ان کا خیال رکھتی ـــــ مگر میرا خیال، میری خوشی میری فکر کی کبھی

تو اس کو پرواہ تھی ـــــ شاید وہ سمجھتی تھی کہ اسے کچھ نہ کچھ نسیم کی طرح آزاد بننا ہے ورنہ میں ـــــ ہیں ـــــ خیر جو بھی سمجھتی ہو ۔ مگر ماں جی کا مزاج تھا کہ خدا کی پناہ ۔ ذرا ذرا سی بات میں مین میخ لگاتی تھیں ۔ کھانا پسند نہ آتا تھا بے کار ، بے کار ، ڈانٹتی رہتی تھیں ۔ دو ایک بار میں نے کہا میں ماں جی سے کہوں گا خواہ مخواہ کیوں خفا ہوتی ہیں ۔ مگر مہرہ نے منع کر دیا ۔ نہیں ـــــ وہ ہمارے گھر ہیں ۔ برا مانیں گی ۔ ان کی خاطر خیال تو کرنا ہی ہے زیادہ برا لگتا تو چند آنسو بہا لیتی ـــــ میں الجھتا تو کہتی ـــــ اماں کی بات پہ بھی یوں ہی رو دیا کرتی تھی ۔ تمھاری ماں کی خدمت اور خیال میں نہیں کروں گی تو کون کرے گا ؟

کبھی کبھی نسیم کی یاد کی کھٹک رات کو سونے نہیں دیتی ۔ جانے اس کا کیا حال ہے ۔ خط تک نہیں لکھا ـــــ اس کا کیا انجام ہو گا ـــــ آخر دوسری شادی بھی تو لوگ کر لیتے ہیں ـــــ مگر اس خیال کے ساتھ خود ہی لرز اٹھتا ۔ مگر اس کی بے وفائی پر نسیم آنسو بہا رہی ہو گی ۔ دنیا کے طعنے سن رہی ہو گی یہ احساس کچلے دیتا تھا ۔

اور پھر ایک دن یہ ناتا بھی ٹوٹ گیا ۔

وہ کام سے ذرا دیر سے واپس آیا تھا ۔ کوارٹر کے سامنے ایک تانگا کھڑا تھا ۔ وہ صحن کے دروازے کے بجائے ڈرائنگ روم میں چلا گیا ۔ چک سے دو عورتوں کی پیٹھ نظر آ رہی تھی جو صحن میں بیٹھی تھیں ۔ میں تھکا ہوا تھا ۔ صوفے پر چپ چاپ کرے کا انتظار کرنے لگا ۔

یہ کس کی آواز ہے ؟ ارے یہ تو نسیم بول رہی ہے ـــــ اس کی آواز کبھی بھول سکتا تھا وہ ؟ ـــــ پسینے میں نہا گیا ۔

” بس بس بس آپا نسیم تم میرے سامنے میرے میاں کو کچھ نہ کہو “ یہ مہرو کی آواز تھی ۔ نسیم کی آواز میں بلا کی کاٹ تھی !

"اوہ ـــ میاں ــــ میاں والی ـــ وہ اس قابل ہے کب کہ میں اس کا نام بھی لوں ـــ"

"ہنھ تبھی جان دیتی تھیں ـــ ان کے پیچھے لگی رہتی تھیں"

"بکومت ـــــ میں ایسے دو کوڑی کے بزدل آدمی کو گھاس ڈالوں گی؟"

"دو کوڑی کا آدمی؟ بیچاری نسیم آپا ـــ اس دو کوڑی کے آدمی کے پیچھے جانے کیسے دیوانی ہو گئیں ـــ ورنہ وہ تو ـــ" کیسا تیکھا طنز تھا مہرو کی آواز میں۔ نسیم غصے میں چلا پڑی۔ "زبان سنبھال کر بولو!"

"میں تو آپا نسیم زبان بھی سنبھالتی ہوں۔ اور اپنا آپا بھی۔ کسی غیر مرد کے پیچھے نہیں پھرتی ہوں"

میں ـــ میں اس بدمعاش کمینے کا پیچھا کرتی ہوں میں ـــ"

"اف یہ نسیم بول رہی ہے۔ میری عاشق زار ـــ

"نسیم بیگم آپ میرے گھر سے تشریف لے جائیے"

"بڑی گھر والی۔ میاں والی ـــ ارے میں چاہتی تو ایک دن میں اس گھر اور اس گھر والے کو تجھ سے چھین لیتی ـــ ایسی بلی چھوکریاں میری جیب میں پڑی رہتی ہیں ـــ تو کیا حقیقت رکھتی ہے ـــ کیسی نفرت تھی اس کی آواز میں۔ وہ کھڑا ہوا سوچ رہا تھا باہر جاؤں یا نہیں۔

"چھین تو نہ سکیں ـــ ہر کوشش ناکام ہو گئی۔ بچاری کی ـــ"

"بڑی خوش فہمی ہے اپنے خصم پر؟ کالا بھدا منحوس صورت ـــ میں ـــ میں اس سے شادی کرتی۔ ڈیڑھ سو روپلی ہیں تم ہی عیش کرو مہارانی ـــ میرا بیاہ تو ایک بڑے زمین دار سے ہو رہا ہے۔ جس کے ہاں ایسے ایسے کتنے نوکر بھرے پڑے ہیں ـــ ہاں وہ ضرور کتے کی طرح دم ہلاتا میرے پیچھے پھرتا تھا"

"اور آگرہ کون گیا تھا؟" اف۔ اسے سب خبریں معلوم ہیں

نسیم کا غصہ، جوش اور نفرت ـــــ اس کا ٹھنڈا لہجہ اور تیکھے طنز دونوں ہی اسے پانی میں ڈبوئے دے رہے تھے۔

"میں منھ توڑ دیا کرتی ہوں بکواس کرنے والوں کا۔"

"نہیں۔ میں تمھیں معاف کرتی ہوں میری ناکام سوکن۔"

تڑ سے ایک آواز بلند ہوئی، اور وہ بے قرار ہو کر باہر نکل آیا۔ نسیم کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ آگ بنی ہوئی تھی۔ مہرو اپنے سرخ گال پر ہاتھ رکھے طنز سے اسے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر بے اختیار دو قدم نسیم کی طرف بڑھائے اور پیچھے ہٹ کر بے ارادے مہرو کو اپنے سینے سے لگالیا۔ "نسیم نسیم۔ ذرا ہوش میں رہو ـــ"

ہوش؟ واہ رے ـ ہوش مند ـــ بے وفا ـــ بے شرم ـــ کمینے ـــ"

اس نے زور سے اس کے منھ پر تھوکا۔ اور قبل اس کے کہ وہ یا مہرو کچھ سمجھ سکتے، برقع اٹھا کر دروازے سے باہر نکل گئی اور اس کے ساتھ اس کی محبت، اس کا خیال، اس کی یاد، اس سے بے وفائی کا احساس، سب دل سے نکل گیا ـــ بس ذلت اور نفرت کا ایک جلانے والا جذبہ تھا جو مدتوں اسے کچلتا رہا ـــ

مگر ـــ مگر ـــ آہ!

کیا اس کی وجہ سے نسیم کی زندگی خراب نہیں ہوئی؟ اس بوڑھے زمین دار سے اس کا بیاہ اسی لیے تو کرنا پڑا کہ وہ بدنام ہو چکی تھی ـــ میاں نے اسے ہمیشہ ستایا اور دکھ دیے ـــ پھر زمین داریاں ختم ہو گئیں۔ اور جو نقد روپیہ، گھر بار، جائداد، باقی رہی تھی اس پر سوتیلی اولاد نے قبضہ کر لیا۔ مہر کے جو چند ہزار روپے ملے وہ کب تک چلتے ـــ آج وہ اپنی چھوٹی بھائی بھاوج بچوں کے ہاں پڑی ہے۔ حسن و جوانی

شوخی و مسرت، امنگ اور حوصلہ کا ایک دلکش مرقع اس کے ہاتھوں مٹ گیا۔ برسوں سے وہ دل کے مرض میں مبتلا ہے..... اور اسے اس کا خیال بھی نہ آیا جس نے کبھی اس سے عشق کا زور و شور سے دعویٰ کیا تھا۔

انسان کا نفس کیسے کیسے دھوکے کھاتا ہے۔ بے وفائی ــــ بے وفائی نسیم سے ــــ مہرو سے ــــ خود اپنی ذات سے!

"چچا چلیے۔ ذرا باہر دھوپ میں چلیے۔ گاؤں کے بہت سے لوگ تعزیت کو آئے ہیں" نازش دروازے میں کھڑا کہہ رہا تھا۔ اُف یہ یادیں ــــ یادیں ــــ یادیں!

"چچا ــــ چلیے باہر ــــ دیکھیے تیز دھوپ پھیلی ہے"۔

"چلو بیٹا ــــ" وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر بہ مشکل کھڑے ہوئے۔ نازش نے سہارا دیا اور بیٹھک کے باہر کے چبوترے پر لے آیا جہاں کئی چارپائیاں پڑی تھیں۔ کچھ کسان، مضارعے، مکھیا، پرانے نوکر اور ان کا خاندان اور کچھ ایسے لوگ جن کو وہ اس وقت پہچان نہ سکتا تھا بیٹھے حقّہ پی رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر رونے کا ایک دبا دبا سا شور اٹھا۔ کسی نے انگوچھا منھ پر رکھ لیا، کسی نے موٹی چادر سے آنسو پونچھے اور کوئی سر جھکائے آنسو بہاتا رہا۔

اس گریہ میں بناوٹ نہ تھی۔ دکھاوا اور نمایش نہ تھی ــــ یہ سچی گہری ہمدردی اور خلوص کا بے اختیارانہ اظہار تھا ــــ وہ بھی ان کے برابر بیٹھ گیا۔

(۹)

ہوائی جہاز کمبخت کو بھی آج ہی لیٹ ہونا تھا۔ دو گھنٹے سے وہ ایرپورٹ پہ بیٹھا ہوا تھا..... مگر دراس کی طرف سے آنے والا جہاز کسی طرح آنہ چکتا تھا۔ انتظار ـــــ انتظار میں ایسا کرب اسے کبھی نہیں ہوا تھا۔ سیاہ سوٹ پر سلیٹی ٹائی ـــــ آنکھوں پہ بڑے بڑے گول شیشوں کی ہلکے نیلے رنگ کی عینک، قیمتی قمیص کے کفوں میں سونے کے بٹن، کلائی پر بیش قیمت آٹو میٹک گھڑی ـــــ اس کے دل کی طرح دھڑک رہی تھی ـــــ اور ہر دھڑکن میں بیتی زندگی کی آوازیں تھیں ـــــ آوازیں جو باہر سے نہیں دل کے اندر سے ابھر ابھر کر اس کے دماغ کے پردوں کو پھاڑ رہی تھیں!

کاش آج صہبا نے اسے وہ پرانا قصّہ نہ سنایا ہوتا تو کم سے کم ضمیر کی یہ خلش، دل کی جلن، ـــــ پشیمانی کا یہ احساس تو اسے نہ کچل رہا ہوتا!

نازش کا فون رسیو کرنے کے بعد جب وہ ذرا سنبھلا تو دوسری خوابگاہ میں سوئی اپنی اپٹوڈیٹ بیوی کو یہ خبر دی تھی اور کہا: "تم بھی تیار ہو جاؤ۔" رسمی اظہارِ رنج و افسوس کے بعد بیوی نے بڑی دانش مندی سے اسے سمجھایا تھا کہ اتنی جلدی جانا کیسے

ممکن ہے۔ ایسا ہی ضروری ہے تو تم پہلے ہو آؤ میں بعد میں چلی جاؤں گی ــــ اس نے پوچھا آخر تمہارے جانے میں کیا دقت ہے؟ وہ بولی تھی۔ آخر تیاری بھی تو کرنی ہوتی ہے۔ کئی ضروری کام ہیں۔ پھر خود آج اس کے گھر پر ایک اہم میٹنگ ہے۔ تم بھی اس وقت پہنچ تو پاؤ گے نہیں اگر ہم دو چار روز بعد ساتھ ہی چلیں تو؟

"نہیں ــ تمہارے جانے کی ضرورت نہیں ــــ میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا" ــــ اس نے تلخی سے جواب دیا۔ رات کا باقی حصہ جاگتے گزرا ــــ صبح بیوی کے بہت اصرار پر بھی اس نے ناشتہ نہیں کیا ــــ اپنے سکریٹری کو فون کر کے ہوائی جہاز میں سیٹ بک کرنے کے لیے کہا تو صہبا جو پاس کھڑی تھی بولی، ڈیڈی میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔ میری سیٹ بھی کرا لیجیے ــــ"

بڑی مشکل سے دو سیٹیں ملی تھیں ــــ وہ سب انتظام مکمل کر کے سامان لینے گھر پہنچا تو وہاں صرف صہبا تھی۔ اس کی بیوی نازنین کہیں گئی ہوئی تھی اور بیٹا تو گھر میں رہتا ہی کب تھا۔ شمیم کی بے راہ روی کا دکھ اسے کچلے دیتا تھا ــــ وہ ہندستان سے باہر رہ کر جانے کیا کیا سیکھ آیا تھا کھانا اور پینا۔ دماغ پر بھی کچھ اثر تھا۔ یہاں آ کر بھی بد قسمتی سے ویسے ہی لوگ اور ماحول اسے مل گیا ــــ سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا، آنکھیں ابل آئی تھیں، پڑھنے لکھنے میں کس کا دل لگتا تھا ــــ کبھی گانے لگتا ــــ کبھی رونے لگتا اور جب گھر سے نکل جاتا تو کئی کئی دن واپس نہ آتا!

اس کا دل اندر سے بیٹھا جا رہا تھا۔ اتنا بڑا حادثہ ہو گیا۔ میری ماں چل بسیں اور بیوی اور بیٹا دن میں چند گھنٹے میرے پاس نہ رہے۔ وہ اپنے عالیشان بنگلہ میں اوپر کی منزل کے اپنے خوب صورت وسیع، قیمتی ساز و سامان سے آراستہ کمرے میں اگاڈرج کی الماری سے اپنے کپڑے نکال نکال کر ڈھیر کر رہا تھا۔ گھنٹی بجائی ــــ اس کا بیرا اندر آیا" بیرا ــــ ہم دلی جا رہے ہیں

یہ سب سامان اور دوسری ضروری چیزیں پیک کر دو ـــــ"

اتنے میں صہبا اندر آگئی "ڈیڈی ـــ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے" ڈیڈی ـــ" اور پھر وہ اس سے لگ کر بیٹھ گئی۔ بڑے "فارمل" سے تعلقات تھے باپ بیٹی کے۔ ہلو ڈیڈی" ہلو صہبی ـــ" سے زیادہ کئی کئی دن بات چیت نہ ہوتی تھی۔ انگلستان سے تعلیم پاکر وہ چند مہینے پہلے آئی تھی اور گھر میں کچھ اجنبیت سی محسوس کرتی تھی جس کو ماں نے دور نہیں کیا۔ باپ نے محسوس تو کیا مگر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ کیسے اس سے قریب آئے۔ مگر اس وقت اس کا دِل اندر سے پگھلا جارہا تھا۔ اس نے بیٹی کو گلے سے لگا لیا ..... اسے یاد آیا۔ جب اس کی دادی کا انتقال ہوا تھا تو وہ بھی ابا سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔ دادی اسے بہت چاہتی تھیں ـــ اماں نے اس کی ڈھارس بندھائی تھی ـــ آج ابا ـــ کا کیا حال ہو گا ـــ اماں کہاں ہیں ـــ اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے اور صہبا بھی روتی رہی۔

بیرے نے چائے کی ٹرولی لاکر سامنے رکھ دی۔ صہبا نے اصرار کرکے باپ کو چائے پلائی۔ کچھ بسکٹ کھلائے۔ ابھی جہاز کی روانگی میں دیر تھی۔

"ڈیڈی ـــ"

"بیٹی!"

"ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں بیٹی ضرور پوچھو!"

"آپ خفا تو نہ ہوں گے؟"

"کیا بات کیا ہے؟" وہ الجھا۔

"ڈیڈی ـــ آپ نے مجھ پر اتنا بہت سارا روپیہ خرچ کیا ـــ شمیم ہزاروں روپیہ وہاں بھی اڑاتا تھا ـــ یہاں بھی خرچ کرتا ہے۔

ممی تو اسی شان اور ٹھاٹ سے رہتی ہیں ۔۔۔"

"تمہارا مطلب کیا ہے ۔ پیسہ ہوتا ہی خرچ کرنے کے لیے ہے ۔۔۔"
انھوں نے بیٹی کو ٹوکا۔

"میں یہ سوچتی ہوں ڈیڈی کہ آپ اتنے امیر ہیں۔ اتنے بڑے بزنس مین ہیں ۔۔۔ ہم لوگ کتنے شان سے رہتے ہیں ۔۔۔ اور دادی اماں اور دادا ابا وہاں اکیلے پڑے ہیں۔ ہندستان آکر تو آپ نے ان کو اپنے پاس بلایا ہوتا ۔۔۔"

"بلایا تھا ۔۔۔ ملنے گیا تب بھی اصرار کیا تھا ۔۔۔ مگر بیٹی بڈھے لوگوں کو اپنی جگہ، اپنے وطن، اپنی عادتوں سے بہت پیار ہو جاتا ہے ۔۔۔ وہاں سے ان کو لانا مشکل تھا ۔۔۔"

"آپ روپیہ تو بھیجتے ہیں ان کو؟" یہ آج اس کی بیٹی کو کیا ہو گیا ہے ۔۔۔ "میں جانتی ہوں ممی نے آپ کو بہکایا ہے ۔۔۔"

"میں نے کئی سال ہوئے ان کو پانچ ہزار روپے بھیجے تھے۔ مگر انھوں نے لینے سے انکار کر دیا ۔۔۔ اب بھی کہا کہ میں روپیہ بھیجوں گا مگر اماں نے کہا کوئی ضرورت نہیں ۔۔۔"

"اور آپ مطمئن ہو گئے؟ آخر وہ کیسے گزر کر رہے ہوں گے؟ آپ ہی نے بتایا تھا کہ دادا ابا نے آپ کے لیے اپنا باغ اور زمین بیچ دی تھی کہ آپ کا بزنس چل جائے ۔۔۔ پھر انکل کے لیے اپنی پنشن بیچ دی ۔۔۔"

"ہاں ۔۔۔" اس نے کھوئے لہجے میں جواب دیا تھا!

"اور آج وہ لوگ اکیلے ہیں ۔۔۔ بیمار ہیں ۔۔۔ غریب ہیں ۔۔۔ ہیں کہاں دادی اماں تو چل بسیں۔ ہائے کتنی اچھی تھیں میری دادی اماں ۔۔۔"

وہ حیرانی سے بیٹی کو دیکھتا رہا ۔۔۔ وہ اتنی حساس ہے؟ باتوں کو اتنی گہرائی سے سوچتی ہے یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

"بوڑھوں کی ابتر حالت میں نے انگلینڈ میں تو دیکھی ہے ڈیڈی ان کی تنہائی، ان کا دکھ ــــ ان کی اولاد کی بے اعتنائی ــــ مگر ہمارا دیس تو اس کے برعکس ہے ــــ یہاں تو بزرگوں کو نعمت سمجھا جاتا تھا ــــ ان کی خدمت کی جاتی تھی ــــ مگر اب ــــ اب ہم شاید بہت ماڈرن ہو گئے ہیں ــــ کلچرڈ ــــ یہ صنعتی تہذیب لے ڈوبے گی ہمیں بھی!"

وہ سر جھکائے بیٹی کا لکچر سن رہا تھا ــــ وہ جس نے ماں کا لکچر نہیں سنا ــــ باپ کی نصیحت پر ناک بھوں چڑھائی اس وقت بیٹی کی باتیں خاموشی سے برداشت کر رہا تھا۔

"ڈیڈی دادی اماں جب ہمارے یہاں آئی تھیں نا ــــ" اس نے بات شروع کی.... "کتنا گھر اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ ہم سب سے محبت کرتی تھیں۔ کھانے پکا کر کھلاتی تھیں۔ باہر کا کام کرتی تھیں۔ ہماری باتیں سنتی تھیں۔ ہمیں مشورے دیتی تھیں۔ اپنے اور دادا ابا اور ان کے ماں باپ کے قصے سناتی تھیں ــــ اور کہانیاں بھی سناتی تھیں۔ ہندوستان کا حال بتاتی تھیں ــــ کتنا ہم لوگوں کو اچھا لگتا تھا ــــ مگر پھر وہ نہ آئیں ــــ یا آپ نے اور ممّی نے نہ بلایا"

"بیٹی ــــ وہ ہم سے خفا ہو کر چلی گئی تھیں ــــ میرے خط کا جواب تک نہیں دیا تھا ــــ"

"ڈیڈی تو اس وقت باہر آپ گئے ہوئے تھے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے وہ دونوں کیوں خفا ہو گئے تھے ــــ"

"معلوم کیوں نہیں تمھاری ممی اور آنٹی سے لڑائی ہو گئی تھی۔ نازنین اور اماں میں کبھی نہیں بنی۔ امّاں اپنی سی کرتی ہیں۔ نازنین اپنے گھر میں اپنا راج چاہتی ہے ــــ"

"کبھی آپ نے سوچا کہ کس بات پر ایسی لڑائی ہوئی کہ وہ لوگ

بغیر آپ سے ملے چلے گئے؟"

وہ ایک دم چونک پڑا ــــ یہ کہنا کیا چاہ رہی ہے ــــ "تم ــ تم ــ تم نے دیکھا تھا ــــ کیا ہوا تھا؟"

"ڈیڈی! جب سے آنٹی اور شہریار آیا تھا ــــ ممی کا ان سے سلوک بڑا خراب ہو گیا تھا ــــ بات بات پر آنٹی ان کا اور دادا ابا کا مذاق اڑاتیں۔ انھیں آرتھوڈاکس اور جانے کیا کیا کہا کرتی تھیں ــــ وہ انگریزی میں باتیں کرتی تھیں، مگر دادی اماں بہت ذہین تھیں۔ تھوڑی بہت انگلش جانتی تھیں ــــ سمجھ جاتی تھیں دادا ابا تو خیر سمجھتے ہی ہوں گے ــــ پھر دو ایک بار ممی سے ان کی جھڑپ ہوئی۔ وہ کہتی تھیں لڑکے لڑکیاں اتنی رات گئے باہر کیوں رہتے ہیں۔ اس پر ممی اور آنٹی دونوں نے ان سے جھگڑا کیا۔ کہا آپ لوگ گندی ذہنیت کے ہیں ــــ قدامت پرست ہیں ــــ یہاں تک کہا "امی آپ میرے گھر کے معاملات میں نہ بولا کیجیے ــــ" وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ تنویر کے تیوری پر بل پڑ گئے ــــ "پھر کیا ہوا! سچ سچ بتانا ــــ"

"ڈیڈی ــــ دادی اماں نے دو ایک بار مجھے الگ لے جا کر سمجھایا کہ بیٹی شریف گھروں کی لڑکیاں اتنی آزاد نہیں ہوا کرتیں ــــ مگر ــ میں ــــ میں ــــ میں بھی ممی کی طرح آنٹی کی طرح ان کو آرتھوڈاکس سمجھتی تھی ــــ"

"اور پھر" اس کی آواز کی گرج سے وہ سہم گئی۔

"ڈیڈی میں چھوٹی تھی ــــ ممی نے مجھے منع کر دیا تھا ــــ کہا تھا ــــ ایسی باتیں باپ سے نہیں کہی جاتی ہیں ــــ اور چند مہینے بعد آپ نے مجھے انگلینڈ پڑھنے کو بھیج دیا اور تھوڑے دن بعد سب کچھ بھول گئی ــــ مگر آج ــــ آج دادی اماں کی موت کا سن کر مجھے سب یاد آ رہا ہے سب کچھ ــــ وہ کسی سوچ میں کھو گئی! اس نے بیٹی کو جھنجھوڑ ڈالا ــــ "کیا ہوا تھا ــــ تم نے کیا دیکھا تھا ــــ"

"ڈیڈی میری خالہ اور ان کا وہ گندا لڑکا شہریار ــــ وہ جب سے آئے

تھے ممی کو بھرتے رہتے تھے۔ ممی ان کا ہر طرح خیال کرتیں محبت کرتیں ـــــ وہ امیر تھے نا ـــــ روپیہ برساتے تھے۔ اور دادی اماں بیچاری کھانا پکاتیں، گھر کی صفائی کرتیں ـــــ مگر جب دادا ابا کو فلو ہو گیا ـــــ سردی ان سے برداشت نہ ہوتی تھی تو وہ ان کی خدمت میں لگ گئیں۔ ممی کو اب ان کا رہنا کھل رہا تھا دادا ابا کی بیماری سے وہ ـــــ وہ بڑی یوریپین بن گئی ہیں نا ـــــ ہاں چھوت کی بیماری سے ـــــ ڈر گئیں ـــــ"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں ـــــ کیا کیا جائے نازنین بہت وہمی ہے پھر تم بچوں ہی کا تو خیال تھا ـــــ"

"ہاں اپنے بچوں سے بڑی محبّت ہے ـــــ مگر بڑھاپے میں دادی اماں کو اپنے بچوں سے محبت نہیں تھی؟ وہ ان کے پاس رہنے کا حق نہیں رکھتی تھیں.....؟"

ذرا دیر وہ چپ رہے ـــــ" مگر آخر میں کیا واقعہ ہوا تھا ـــــ"

"ڈیڈی ـــــ میں ـــــ میں کیسے بتاؤں آپ کو کہ کیا ہوا ـــــ"

"بتاؤ ـــــ جو بھی حقیقت ہے آج تو بتا دو ـــــ"

"شہریار میرے ساتھ گھومنے پھرنے جاتا تھا۔ ہم لوگ فلم دیکھنے۔ ڈانس کرتے، کلب میں جاتے ـــــ رات کو ڈنر کھا کر تفریح کر کے واپس آتے تھے ـــــ یہ بات دادی امی کو بری لگتی تھی ـــــ مگر دادا نے ہمیں اجازت دے رکھی تھی ـــــ آخر وہ میرا فرسٹ کزن تھا ـــــ مگر ایک دن' ـــــ ایک دن رات گئے ہم لوگ واپس آئے تو دادی اماں کچن میں تھیں ـــــ شاید دادا ابا کے لیے پانی گرم کر رہی تھیں۔ ہم اوپر اپنے کمروں میں جا رہے تھے ـــــ ڈیڈی ـــــ شہریار نے اس دن مجھ سے بہت بہت فلرٹ کیا تھا ـــــ میں نے اسے ڈانٹا بھی دیا تھا ـــــ اور پھر زینے میں اس نے.....اس نے مجھے پکڑ لیا اور کس کیا..." وہ سر جھکا کر کہہ رہی تھی! تنویر کا منھ

لال ہوگیا۔" پھر — پھر —" وہ کچھ اور نہ کہہ سکی.....

دادی اماں شاید کچن سے دیکھ رہی تھیں — وہ تیزی سے آگے بڑھیں — مجھے کھینچ کر سینے سے لگالیا اور شہریار پر برس پڑیں — "کمینے — ذلیل — آوارہ —" جانے کیا کیا کہا" تو میری معصوم بچی کو — ان کی آواز رندھ گئی — ایک دم وہ آگے بڑھیں — جانے وہ کیا کرنا چاہتی تھیں — مگر شہریار نے ان کو دھکا دے دیا اور وہ سیڑھیوں سے نیچے لڑھک گئیں — بہت چوٹیں آئیں۔ خون نکل آیا —"

"اف — اف!" تنویر کا سر چکرا رہا تھا۔

"ممی اور آنٹی ان سے الٹی لڑنے اور بحث کرنے لگیں۔ دادا ابا کو بھی اس دن غصّہ آگیا۔ وہ دادی اماں کو اپنے کمرے میں اٹھا لے گئے — اور ممی کو ڈانٹا — آنٹی سے کہا۔ آپ کو میرے بیٹے کے گھر میں دخل دینے کا حق کس نے دیا —" وہ کہتے کہتے رکی — مگر آنٹی نے الٹی ان کی انسلٹ کی اور ممی چپ رہیں — اگلے دن ہی دادا ابا نے واپسی کا ارادہ کرلیا — مجھ سے کہا — میں نے آپ کے سکریٹری کی مدد سے ان کی ہندوستان جانے کی سیٹیں کرائیں دادی اماں کی مرہم پٹی کرائی — ممّی نے بیان لکھوایا کہ یہ باتھ روم میں گر پڑی تھیں — جانے سے پہلے دادی اماں نے ایک بار مجھے کلیجے سے لگا کر کہا میری بچی خاندان کی عزت تیرے ہاتھ ہے —" اور پھر آپ کے آنے سے پہلے ہی وہ لوگ چلے گئے — واپسی کے ٹکٹ تو ان کے پاس تھے۔ ممی نے سختی سے مجھے ڈانٹ دیا تھا کہ ڈیڈی آپ سے ذکر نہ کردں۔ اور آنٹی الٹی بگڑ گئیں۔ شہریار نے بہت زبان چلائی — مگر ان کو ممی نے منالیا — وہ سمجھتی تھیں کہ یہ دادی اماں نے بہتان باندھا ہے۔

"اور میں — اور میں —"

وہ کڑ کا — "اور تم نے ماں سے نہیں کہا —"

"ڈیڈی میں چودہ برس کی تو ہی تھی ——— ڈر گئی ——— کہا تو وہ مجھے الٹا ڈانٹنے لگیں کہ وہ تیرا بھائی ہے ——— فرسٹ کزن کا ہو سکتا ہے تیرا اسی سے بیاہ ہو جائے ———"

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی ———

پھر اس سے ٹھہرا نہیں گیا۔ گھر سے نکل کر قبل از وقت ہی ایرپورٹ پہنچ گیا ——— نازنین بھی ایرپورٹ پہنچی مگر اس نے بات نہیں کی۔ اس کے دل میں آگ سی جل رہی تھی ——— اس کا ضمیر اسے کچوکے دے رہا تھا ——— نازنین رسمی باتیں کر کے واپس چلی گئی ——— صہبا آ گئی ہے مگر وہ الگ صوفے پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہے ——— اس نے سیاہ لباس پہن رکھا ہے ——— سیاہ بل باٹم۔ سیاہ جرسی۔ اور سیاہ مفلر نما دوپٹہ بھی گلے میں ڈال لیا ہے ——— وہ اس سے آنکھ چرا رہی ہے۔

خدا خدا کر کے ہوائی جہاز آیا' اس کی روانگی کا اعلان ہوا..... اور وہ دونوں سوار ہو گئے ——— اس کی اور صہبا کی سیٹیں برابر برابر تھیں ——— وہ کھڑکی کے برابر بیٹھ گیا۔ صہبا نے سب سامان رکھا اور اس کے برابر کی سیٹ پر بیٹھ گئی ——— تنویر نے سر کرسی کی پشت پر جھکا دیا ——— ساری رات اور سارا دن اُسے جاگتے گزر گیا تھا ——— تھک کر چور ہو رہا تھا ——— جانے کب آنکھ لگ گئی ——— بکھرے بکھرے خواب آتے رہے۔ وہ اماں کی گود میں رو رو کر مچل رہا ہے ——— وہ اسے کلیجے سے لگائے آنچل سے ڈھکی بیٹھی ہیں ——— آسماں سے ایک بڑی سی چیل اُڑتی آتی ہے اور اسے اماں کی گود سے اپنے پنجوں میں دبا کر اڑ جاتی ہے۔ وہ ہوا میں معلق ہے ——— نیچے سے اماں کی چیخیں سنائی دے رہی ہیں ——— "تنو ——— تنو ——— میرا بچہ ——— اماں ——— اماں ——— میری اماں ——— ڈیڈی ——— ڈیڈی ——— یہ زرا سا جوس پی لیجیے ——— ایر ہوسٹس خالص ہندوستانی کپڑوں میں چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ بکھیرے جوس کا گلاس اسے

دے رہی تھی!

صہبا کے اصرار پر اس نے جوس پی لیا تھا۔

جہاز بہت بلندی پر اڑ رہا تھا کھڑکی میں سے سفید بادلوں کے دَل کے دَل جہاز کے نیچے ــــ بہت نیچے یوں محسوس ہو رہے تھے جیسے چاندی کے پہاڑ ہوں۔ چوٹیاں اور گھاٹیاں اور غروب آفتاب کی کرنیں بادلوں میں قوس قزح کے سات رنگوں کو بکھیر رہی تھیں! اندران بادلوں میں اسے طرح طرح کی شکلیں بنتی بگڑتی محسوس ہو رہی تھیں ــــ کوئی ابا سے ملتی ہوئی کوئی اماں کی طرح گود میں لیے ہوئے کوئی شبیہہ اسے اپنا بچپن یاد دلا رہی تھی۔

وہ دادی اماں کا تو لاڈلا تھا ہی ــــ مگر اماں بھی اسے بیحد چاہتی تھیں۔ ایک بچہ کے مرنے کے بعد انھیں اس سے بے انتہا پیار اور اس کی جان اور صحت کی فکر لگی رہتی تھی ــــ خورشید ــ اس سے سال بھر چھوٹی تھی مگر اماں کی توجہ اس پر چھوٹی بہن سے زیادہ تھی ــــ وہ ابا میاں کی زیادہ لاڈلی تھی۔ رحیمن بوا اسے پالتی تھیں ــــ وہ اسکول سے جب تک واپس نہ آتا اماں کھانا نہ کھاتی تھیں۔ ابا میاں کسی بات پر ڈانٹ دیتے تو ان کو بہت ناگوار گزرتا کبھی کبھی الجھ پڑتیں ــــ وہ اپنی ساری خواہشیں، ساری ضدیں اماں ہی سے پوری کراتا تھا۔

اس کی شادی پر بھی ــ یہ اماں ہی تو تھیں کہ انھوں نے ابا میاں کو نازنین سے بیاہ کرنے پر راضی کیا تھا ــ عالیہ کا بلکل خیال نہ کیا جس کو وہ سگی بیٹی کی طرح چاہتی تھیں۔ دس برس کی عمر سے اسے پالا تھا ــــ کتنے چاؤ، کتنی دھوم دھام، کتنے شوق سے وہ اپنی بہو کو بیاہ کر لائی تھیں ــــ مگر نازنین ــــ نازنین نے گھر والوں کو ہمیشہ ٹک ٹڈا دن کیا ــــ اماں سے الجھ پڑتی۔ ابا میاں کا لحاظ نہ کرتی ــــ اس وقت میں اس کا کیسا دیوانہ تھا۔ ہر بات میں اسی کی طرف داری کرتا ــــ اسی کے کہنے سے بجائے دلّی کے بمبئی گیا ــــ اس

کے باپ کے ساتھ بزنس میں شریک ہوا ــــ پھر باہر کے ملکوں میں رہنے کی خواہش بھی اسی کی تھی ــــ اماں اور ابا میاں کتنے اداس تھے ــــ اس نے ان سے کہا تھا ــــ ذرا میں سیٹل ہو جاؤں تو آپ لوگ وہیں میرے پاس آکر رہیے گا ــــ اس نے لالچ دیا تھا۔ اماں میں آپ کو حج بھی کراؤں گا اور زیارات بھی ــــ اور پھر جب اس کو بزنس میں گھاٹے کا اندیشہ تھا، سسر نے پیسہ دینے سے انکار کر دیا تھا ــــ تو یہ اماں ہی تو تھیں جنھوں نے ابا میاں سے اصرار کر کے آموں کا باغ بکوادیا تھا ــــ اس باغ سے کئی ہزار روپے سال کی آمدنی تھی ــــ باغ بیچ کر ــــ پچاس ہزار روپیہ انھوں نے سارا کا سارا اسے دے دیا تھا ــــ اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ بزنس جمتے ہی وہ سب روپیہ واپس کر دے گا ــــ یا ماہانہ مقررہ رقم بھیجے گا ــــ

آہ ــــ اف ــــ وہ یہ سب کیوں بھول گیا؟ جب برسوں بعد اس نے پانچ ہزار روپے بھیجے اور ابا میاں نے واپس کر دیے کہ یہ بھی تم ہی رکھ لو تو وہ یہ کیوں نہ سمجھا کہ یہ بات انھیں ناگوار گزری ہے ــــ وہ پچاس ہزار نہ سہی تیس ہزار نہ پچیس ہزار کچھ تو واپس کرتا ــــ یا ماہانہ خرچ ہی دیتا ــــ دو سو روپے تو بھیجنا شروع کیے تھے ــــ مگر اماں کی خفگی کا خط آیا ــــ تو وہاں عیش کر رہا ہے اور ہمیں دو سو روپلی بھیجتا ہے! یاد رکھ ہم تیرے محتاج نہیں اب بھی چار کو کھلا کر کھا سکتے ہیں ــــ نازنین نے اس کے غصے میں تیل ڈالا تھا ــــ اور اسے سمجھایا تھا کہ ان کے پاس اپنے خرچ کو بہت ہے ــــ پھر بھی وہ کچھ دن تک بھیجتا رہا مگر جب اسے معلوم ہوا کہ اس کے بھیجے ڈرافٹ کیش کرائے ہی نہیں جاتے تو وہ روٹھ گیا ــــ وہ سمجھتا تھا کہ ابا میاں کو اس کی پرواہ نہ رہی۔ خرچ کی ایسی ضرورت بھی کیا ہے۔ بڈھے آدمیوں کا خرچ ہی کیا ہوتا ہے؟ اور مجھے اپنے بچوں کو اونچی تعلیم دینی ہے۔ باہر کے ملکوں سے وہ اعلیٰ ڈگریاں لیں گے۔ انھیں سیٹل کرنا ہے۔

اور ہندستان تو اتنا سستا ملک ہے۔ ہر چیز آسانی سے مل جاتی ہے
— نوکر مل جاتے ہیں — یہ تو اب اسے واپس آ کر اندازہ ہوا کہ ہندستان
کی مہنگائی نے مڈل کلاس کی تو کمر ہی توڑ رکھی ہے — سوچتے سوچتے پھر وہ اونگھ
گیا — ایک اونچا پہاڑ۔ ہر طرف برف ہی برف ہے — بادل ہی بادل ہیں
— وہ ڈھلوان پر پھسل رہا ہے — ہر کوشش کے باوجود اپنے کو روک
نہیں پا رہا — اس کے جسم پر کپڑے بھی نہیں ہیں — وہ ننگا ہے — گر
رہا ہے — اور نیچے نشیب میں اس کے ماں اور باپ دونوں ہاتھ پھیلائے
کھڑے ہیں — اماں کے بال بکھرے ہیں، منھ سوجا ہے۔ جگہ جگہ زخم ہیں
مگر وہ چلا رہی ہیں — تنو — تنو — سنبھل کے میرے لعل سنبھل — نیچے
سمندر ہے — سمندر ہے —"

"اف — خدایا — اف"

صہبا اس کے گرد اپنی باہیں پھیلائے تھی۔ ڈیڈی — میرے ڈیڈی
— اب ہوشیار ہو جائیے — آدھ گھنٹے میں ہم دلّی پہنچ جائیں گے —
اور جوس کا ایک گلاس پھر اس نے باپ کے منھ سے لگا دیا۔" آپ بھوکے
ہیں ڈیڈی —"

اس کی نظر کھڑکی سے باہر پڑی۔ غروب آفتاب کا منظر بہت خوشنما
تھا۔ یہ چاند — سورج — تارے — روشنی، دھوپ — پھل — پھول
اماں کو ان کا نظارہ کتنا پسند تھا — میرے پاس آئیں تو کہتی تھیں ارے تنو
تم کیسے اس نگوڑے ملک میں رہتے ہو جہاں دھوپ نہیں — سورج کی
روشنی اور گرمی نہیں اور چاندنی ٹھنڈی خوبصورت چاندنی تک نظر نہیں آتی
— الٰہی توبہ — دم گھٹتا ہے میرا تو — اماں — اماں — قبر کی تاریکی
آپ کیسے — کیسے جھیلیں گی؟
کتنے سال ہو گئے وہ ابا اور اماں سے اچھی طرح نہیں ملا۔ ہندستان

آنے کے بعد دلّی میں چار دن ٹھہرنا تھا تو وہ ایک دن اور رات کے لیے
ان کے پاس ٹھہر گیا تھا! مگر وہ کوئی ملنے میں ملنا تھا؟ اور اب! اب وہ
کبھی اماں سے نہ ملے گا ــــ صورت بھی دیکھنے کو ملے گی کہ نہیں؟ اس
وقت میں ان سے خفا ہو گیا تھا وہ اس سے رکھائی سے ملے تھے مگر اس نے
دیکھا تھا ــــ سات سال میں ابا میاں کتنے کمزور اور بوڑھے ہو گئے ہیں
ــــ اماں کی صحت بہت خراب ہے! اسے اختر چچا نے بتایا' دو سال پہلے
ابا میاں بہت بیمار ہو گئے تھے ــــ دلی لے جا کر اسپتال میں ان کا علاج کرایا
تھا اماں نے ــــ اس نے سوچا تھا وہ پھر جلد ابا میاں کے پاس آئے
گا۔ بیوی بچوں کو بھی لائے گا ــــ ان کو مجبور کرے گا کہ وہ اس سے خرچ لیا
کریں یا ساتھ چل کر وہیں رہیں مگر حیدر آباد جا کر وہ اپنے کاموں میں اتنا
الجھ گیا کہ پھر نہ آ سکا ــــ اماں کی بیماری کی خبر پر بھی نہ آ سکا ــــ اور
آج ــــ آج اس پر یہ حقیقت کھل گئی کہ.... اماں اور ابا میاں کیوں
ناراض ہیں! ان کا ظرف کتنا بڑا ہے کہ اس سے اتنے بڑے واقعہ کی
شکایت نہیں کی ــــ وہ کتنے خوددار ہیں کہ انھوں نے اس کا روپیہ
قبول نہیں کیا ــــ ہائے وہ لوگ غزالی کی بدتمیزی کے بعد مرے پاس پناہ
لینے آئے تھے ــــ میں نے ہی تو ان کو ٹکٹ بھیجا تھا ــــ انھیں اپنے
بڑے بیٹے پر اعتماد تھا ــــ جو چکنا چور ہو گیا ــــ اس نے کیوں وجہ
معلوم کرنی نہیں چاہی۔ وہ آسانی سے ہندوستان آ سکتا تھا ــــ لا سکتا تھا
خرچ لینے پر مجبور کر سکتا تھا ــــ وہ عیش کرتے رہے اور اس کے ماں باپ
علاج دوا کے لیے بھی پریشان ہوتے رہے! اس عمر میں تو انسان کو
راحت و آرام و سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوا علاج کے لیے روپے
کی ضرورت ہوتی ہے۔ دل کی تسلی کے لیے اولاد کی قربت کی ضرورت
ہوتی ہے ــــ صہبا اور شمیم کے لیے ان لوگوں نے اس کے مقابلے پر

کچھ بھی نہیں کیا جو اماں اور ابا میاں نے کیا تھا۔ جتنی محبت، اپنائیت دی تھی۔ اپنا سب کچھ ان لوگوں پہ لٹا دیا تھا ــــ پھر بھی وہ ان سے کتنی محبت کرتا ہے ــــ ہر سال صہبا کو بلا کر اپنے پاس رکھتا رہا ــــ اور وہ بڈھے، بیمار لوگ میرے لیے، غزالی کے لیے، شاہین کے لیے اکیلے تڑپتے رہے! خورشید نے اسے لکھا تو کتنا ناگوار گزرا تھا۔ ایک تلخ جواب اسے دے دیا تھا۔ بعض وقت انسان اپنے پیاروں کے لیے بھی کیوں بے حس ہو جاتا ہے؟

آج اس کے پاس سب کچھ ہے۔ گھر۔ موٹر، ساز و سامان، عیش و آرام اتنا بڑا بزنس ــــ لاکھوں روپیہ ــــ اولاد ــــ بیوی ــــ دوست ــــ مگر ــــ پھر بھی دل کو سکون نہیں ــــ اطمینان نہیں۔ فرصت نہیں ــــ وہ ــــ وہ ایک مشین ہے ــــ روپیہ کمانے کی مشین! ــــ بیٹے کا سکھ نہیں ــــ بیوی سے رفاقت نہیں ملی ــــ اُس بیوی سے جس نے اسے ٹوٹ کر چاہا ــــ اور سب سے اس کی خاطر کٹ گیا ــــ صہبا اس کی لاڈلی بیٹی اس کو کیا سمجھتی ہے؟ کیا اس کے دل میں وہ عزت وہ چاہت ــــ وہ اعتماد ہے جو ہمیں اپنے ماں باپ سے تھا! مگر ــــ ہم نے کیا کیا ان کے ساتھ ــــ خورشید نے سچ ہی لکھا ہے ــــ جب ہم اپنے بزرگوں کو راحت نہ دے سکے تو ہمارے بچے ــــ ہمارے بچے ــــ کیا دیں گے ہمیں ــــ کیا قدرت یوں بدلہ دے گی ــــ

اس نے ہاتھ بڑھا کر صہبا کو اپنے سے لپٹا لیا جو بالوں میں کنگھی کر کے لپ اسٹک ٹھیک کر رہی تھی!

(۱۰)

ثریا اداس ٹرین میں بیٹھی تھی۔ نازش کا تار اسے رات ہی مل گیا تھا مگر وہ دفتر سے نمٹ کر دلیؔ کی طرف روانہ ہوئی تھی۔ بچاری چچی جان ــــ آخری خدمت کرنے کی حسرت ہی رہ گئی۔ پچھلی بیماری میں تو دو ہفتے کی چھٹی لی تھی ــــ اب یہی سوچتی رہی کہ یہ کام نمٹ جائے، یہ کام ہو جائے تو اکٹھی ہفتے بھر کو جائے گی۔ ہاــــ جانے کون تھا ان کے پاس آخری وقت میں۔ بچارے سہیل چچا نے کیسے یہ سب کیا ہوگا؟ کیسے سب کچھ جھیلا ہوگا امی، اور بابا، خود بوڑھے اور بیمار ہیں ــــ مگر ان میں کتنی خدا ترسی، ہمدردی اور دوستی کا پاس ہے.... کاش ــ کاش ــــ"

"ارے ثریا بھابی آپ بھی گھر جا رہی ہیں" سروج مسرا نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ زنانہ ڈبہ میں اس وقت ہجوم کم ہی تھا۔ "آپ کا چہرہ کیسا ہو رہا ہے؟ خیریت تو ہے نا ــــ؟" ثریا نے کھنکھار کر گلا صاف کیا" رات نازش کا تار ملا۔ سہیل چچا کی بیوی مر رخ چل بسیں ــــ"

سروج مسرا، شیام سندر مسرا کی بیٹی تھی۔ ڈاکٹر تھی۔ میرٹھ میں پریکٹس

کرتی تھی مگر ہر ہفتے اپنے ماں باپ سے ملنے جاتی تھی۔ سہیل میاں، مسرا اور اختر علی کے گھر ایک دوسرے کے قریب ہی تھے۔" مہرو ماسی کتنا پیار سے ملتی تھیں" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ــــ" پندرہ دن پہلے تو واپس آئی تھی۔ ثریا بھابی۔ وہ کمزور ضرور تھیں مگر بیمار تو نہیں تھیں۔"

"آٹھ یا نو دن پہلے ان پر دل کا حملہ ہوا تھا سروج!"

"ہاں ان کا بلڈ پریشر تو فالج کے حملے کے بعد سے ہائی رہنے لگا تھا۔ میں ان سے کہا کرتی تھی کہ ماسی آپ آرام کریں اور پرہیزی کھانا کھایا کریں۔ مگر وہ نمک بھی کہیں کا پرہیز نہ کرتی تھیں ــــ اور سارے گھر کا کام اور سہیل چاچا کی خدمت بھی کرتی رہتی تھیں......"

"بہن وہ کیا کرتیں پھر ــــ کام تو کرنا ہی پڑتا تھا سہیل چاچا کی خدمت خیال کرنے والا اور کون تھا ــــ پھر وہ اتنا چاہتی تھیں اپنے میاں کو ــــ ہم لوگ تو سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان بڈھے میاں بیوی میں آج تک اتنا عشق کیسے تھا ــــ ثریا کہیں کھو گئی۔

"ان کی اولاد بڑی کٹھور ہے ثریا بھابی۔ دو بیٹے، دو بیٹیاں ہیں۔ ان کی بھی دو جوان اولادیں ہیں مگر کسی سے اتنا نہیں ہوتا کہ ان کے پاس آ کر رہے ــــ پچھلی بار وہ ماں سے رو رو کر کہہ رہی تھیں" بھابی جی ــــ خدا کسی کو میری جیسی بے درد اولاد نہ دے ــــ" میں سمجھتی ہوں وہ لوگ روپیہ پیسہ بھی ان کو بہت کم دیتے ہیں ــــ"

بہت کم کیا، دیتے ہی نہیں ــــ جیسا علاج ہونا چاہیے وہ بھی نہیں ہو سکا تھا۔ اب بھی کیا ہوا ہو گا ابو اور امی اور نازش جتنا بھی خیال ہو سکتا ہے کرتے ہیں مگر بھئی اپنی اولاد، اپنے عزیز ــــ آخری زمانے میں پاس نہ ہوں، خدمت نہ کریں ــــ پوچھیں نہیں ــــ یہ اتنا سخت تکلیف دہ ہے کہ ــــ کہ....."

"ماں کہتی ہیں وہ سہیل انکل سے دس بارہ سال چھوٹی ہیں۔ مگر ان سے زیادہ بوڑھی لگتی تھیں۔ ان کے اندر جیسے گھن لگ گیا تھا۔۔۔ پچھلی بیماری میں جب میں آکر ان کے پاس رہی تھی۔۔۔ ہائے ثریا بھابی کیسا وہ ایک ایک کا نام لے کر بے ہوشی میں پکارتی تھیں۔۔۔ ہاتھ سے ٹٹولتی تھیں۔۔۔ تنویر۔۔۔ غزالی۔۔۔ بھیا۔۔۔ آگئے۔۔۔ شاہین۔۔۔ خورشید۔۔۔ مگر کوئی بھی کمبخت نہیں آیا۔۔۔ بس سنا ہے بعد میں خورشید آئی تھی وہ بھی چند دن کے لیے۔"

"سروج ہمارے ہاں بھی بڈھوں کا مسئلہ بڑھتا جا رہا ہے۔۔۔ اگرچہ ابھی دیہات اور چھوٹے شہروں میں یہ مرض زیادہ نہیں۔۔۔ مگر نوجوانوں کو باہر جا کر کمانے کی دھن رہتی ہے۔۔۔ چاہے وہ ہندستان کے بڑے شہر ہوں یا دوسرے ملکوں میں جانا ہو۔۔۔ نازش کو سعودی عرب میں بڑی اچھی نوکری مل رہی تھی۔۔۔ ریاض یونیورسٹی میں۔۔۔ مگر انھوں نے انکار کر دیا۔۔۔ ابو اور امی کو چھوڑ کر جانے پر وہ کسی طرح تیار نہ ہوئے۔۔۔"

"اور آپ نے بات مان لی۔۔۔ برا نہیں لگا۔۔۔"

"کیسے نہ مانتی بہن۔ آخر ان کے ماں باپ میرے بھی تو کچھ ہیں! پھر ان کا یہ کتنا احسان ہے کہ انھوں نے مجھے میرٹھ میں چھوڑ رکھا ہے۔۔۔ میری خالہ بہت بوڑھی اور بیمار ہیں نا۔ انھوں نے مجھے پالا پوسا پڑھایا لکھایا۔۔۔ میرے سوا کوئی نہیں۔۔۔ یوں کہو۔۔۔ کوئی پوچھتا نہیں۔۔۔ اگر میں بھی ان کو چھوڑ دیتی تو....؟ میرا خود ہی دل نہ چاہتا تھا نازش کا دل بہت بڑا ہے۔۔۔ پھر میں بھی ان کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھتی ہوں۔۔۔"

"مگر جب وہاں وہ خوب روپیہ کماتے۔۔۔ یہاں روپے بھیجتے۔۔۔ نوکر بھی تو رکھے جا سکتے تھے۔۔۔ آپ بھی اپنی ماسی کے پاس نوکر رکھ دیتیں۔"

"نوکر تو سروج اب بھی تین تین ہیں۔۔۔ اور زیادہ روپیہ کما کر کون سا سکھ ملتا ہے۔۔۔ ہوس بڑھتی چلی جاتی ہے۔۔۔ میں نے تو یہی دیکھا

ہے۔ شریف اور نرم جذبات، لطیف احساسات، دولت کے ڈھیر کے نیچے کچل جاتے ہیں۔ پھر پیسہ ہی ماں، پیسہ ہی باپ ــــ پیسہ ہی خدا بن جاتا ہے۔“

”خیر یہ تو کوئی بات نہیں۔ پیسے والے بھی اپنے خاندانوں کی بہت مدد کرتے ہیں۔ میں کئی ایسے لوگوں کو جانتی ہوں جنھوں نے باہر جا کر اپنی فیملی کی زندگی بدل دی۔ میرے ایک کولیگ تھے ڈاکٹر اسلم ــــ بڑے غریب گھرانے کے تھے۔ ان کی فیملی زیادہ تر پاکستان میں تھی ــــ پھر ان کو کہیں سے وظیفہ مل گیا۔ وہ آگے پڑھنے کے لیے ولایت چلے گئے ــــ وہیں رہ پڑے۔ نوکری کرلی ہے۔ شادی بھی کرلی ہے ــــ مگر اپنے گھر والوں کو اتنا روپیہ، سامان بھیجتے ہیں۔ چھوٹوں کی تعلیم کا انتظام کرتے ہیں۔ کسی کو اپنے پاس بلا کر رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو کل تک دو تین سو میں کنبہ پالتے تھے ارے اب آپ دیکھیں کیسے ٹھاٹ سے رہتے ہیں ــــ“

”ہاں بی بی۔ ایسے لوگ بھی ہیں ابھی ہمارے ملک میں!“

”دراصل ثریا بھابی یہ جو ہمارے ہاں جائنٹ فیملی سسٹم تھا ــــ یہ ختم ہو رہا ہے اور اس کا اثر بہت پڑ رہا ہے۔ پہلے سارا پریوار اکٹھا رہتا تھا۔ دو چار باہر چلے بھی گئے تو گھر میں ایسے لوگ ہوتے جو بوڑھے لوگوں کی سیوا کرتے، دیکھ بھال کرتے تھے۔“

”ہاں یہ بات بھی ہے ــــ اور ایک اور بات ہے ــــ لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم اور خاص کر نوکری پہلے کہاں ہوتی تھی؟ لڑکیاں، بہوویں سب گھر میں رہتی تھیں۔ مرد باہر بھی گئے تو وہ بزرگوں کی خدمت کرتی تھیں۔ بیماری میں تیمارداری کرتی تھیں ــــ اب ان پر کتنا بار ہے۔ نوکری بھی کریں ــــ گھر بھی سنبھالیں اور بڑے بوڑھے ہوں تو ان کی خدمت کریں۔ میاں اور بچوں کی دیکھ بھال کریں ــــ آخر کیا کیا کریں وہ بیچاریاں!

”ہاں شہروں میں تو یہ بات ضرور ہے ــــ مگر دیہاتوں اور قصبوں

میں تو اب بھی لوگ اکثر اکٹھے رہتے ہیں.... مگر اب ہم میں سیوا کی وہ بھاونا نہیں۔ بڑے لوگوں کا وہ آدر نہیں۔ میری کلینک میں نرسیں ہیں۔ دو ایک آیائیں ہیں — کئی ان میں بوڑھی ہیں — بیمار بھی رہتی ہیں — ارے کیا بیٹے بیٹیاں بہوویں سب ہیں مگر یہ بیچاری عورتیں کام کرنے پر مجبور ہیں — اور وہ لوگ پیسہ الٹا ان سے اینٹھ لیتے ہیں... ایک عورت میرا علاج کرا رہی ہے عمر پینسٹھ سنتر سے کم نہ ہوگی۔ ہاتھ کی ہڈی بھی ٹوٹ چکی ہے۔ کھانسی دمہ کی مریض ہے۔ مگر چار گھروں میں مسالہ، برتن جھاڑو کا کام کرتی ہے۔ ایک بیٹی بیاہنے کو ہے۔ ایک بیٹا دق میں مبتلا ہے — چھوٹا کما رہا ہے مگر اسے کچھ نہیں دیتا — میں علاج کر سکتی ہوں مگر ان دکھوں کا علاج کیا ہے؟"

"سروج بہن اس طبقے کی یہ حالت تو اس غریبی اور مفلسی کی وجہ سے ہے جو ہمارا مقدر بن گئی ہے۔ اب تک ہمارے دیس کی حالت نہیں بدلی ہے"

"یہ تو بات نہیں ثریا بھابی۔ آپ دیکھیے مزدوروں کی حالت بہت بدلی ہے۔ مستریوں، کاری گروں کی اجرتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں — بہتر کپڑے ہیں۔ سائیکلیں ہیں۔ ریڈیو یا ٹرانسسٹر ہیں — تیل کے چولھے ہیں۔ عورتوں کے جسم پر زیور ہیں — ان کے پاس اب وہ چیزیں ہیں جن کا محنت کش طبقہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔"

"مگر یہ چیزیں سب کے پاس نہیں ہیں۔ بڑے شہروں کو چھوڑ دو۔ گاؤں اور قصبوں میں ان کی حالت اتنی اچھی نہیں ہے سروج بہن — اور اس کا سبب ہے مہنگائی۔ کمر توڑ مہنگائی۔ جتنی آمدنی ہوتی ہے سب کھانے میں خرچ ہو جاتی ہے پھر بھی پیٹ بھر نہیں ملتا۔ بیماریاں، ناقص غذائیں اوپر سے اور تباہ کر رہی ہیں —"

"ایک چیز تو آپ بھول گئیں بھابی — سب سے زیادہ تباہی تو یہ بچوں کی کثرت پھیلا رہی ہے — میرا تو یہ کاروبار ہی ہے۔ ارے بھئی ایک

ایک کے چھ ــــ سات ــــ آٹھ بچے ـــ ایک گود میں، ایک پیٹ میں ایک انگلی پکڑے ــــ آبادی بڑھتی جا رہی ہے ـــ کون سا ملک ہے جو اتنی بڑھتی ہوئی آبادی کے مسئلے کو حل کر سکے گا ـــ؟"

یہ تو نہیں ہے۔ کئی سوشلسٹ ملک ہیں جہاں یہ مسئلہ نہیں ہے۔ سب کو گھر ملتا ہے، کپڑا ملتا ہے، بے کاموں کو کام نہ مل سکے تو الاؤنس ملتا ہے"

"مگر یہ وہی ملک تو ہیں جہاں آبادی کم ہے آمدنی کی تقسیم میں بھی ناانصافی نہیں ـــ ہمیں تو یہ آبادی ـــ یہ بچے تباہ کر رہے ہیں ـــ کتنا سمجھاؤ عجب بے حس لوگ ہیں ـــ"

"سروج تم ڈاکٹر ہو ـــ سب جانتی ہو ـــ زیادہ بچے پیدا ہونے کا کارن بھی یہ غریبی ہی ہے۔ ان کی جو واحد تفریح ہے، اس کا نتیجہ اولاد ــ اولاد ـــ اولاد ہی ہے ـــ"

"مگر وہ لوگ فیملی پلیننگ کے طریقے کیوں نہیں اپناتے ـــ جہالت، اور ضد کی وجہ سے بات نہیں سنتے۔ بھگوان یا خدا جتنے بچے دے گا اتنے ہوں گے ـــ کہتے ہیں جو منھ چیرتا ہے وہ کھانے کو بھی دیتا ہے ـــ"

"ہم لوگ صحیح طریقے سے ان کو سمجھاتے بھی تو نہیں ہیں۔ میرا مطلب ہے ان کی صحیح تعلیم و تربیت ہونی چاہیے۔"

"میرا تو اسی مسئلے کو لے کر روز کسی سے جھگڑا ہو جاتا ہے ـــ"

"بہن یہ مسئلے جھگڑوں سے نہیں سلجھائے جاتے ـــ اس میں بہت صبر کی، بہت دھیرج کی ضرورت ہوتی ہے ـــ"

کچھ دیر خاموشی رہی ـــ آخر ثریا نے خاموشی کو توڑا۔

"خدا کرے ہم وقت پر پہنچ جائیں ـــ بچی کی صورت تو دیکھ لیں"

"بھابی مجھے تو بڑی وحشت ہوتی ہے ـــ دل جانے کیسا کیسا ہونے لگتا ہے ـــ"

"پھر تم ڈاکٹری کیا خاک کرتی ہوں گی۔

"وہ اور بات ہے۔ اپنوں کو مرتے دیکھنا ـــــ بہت ـــــ بہت کٹھن کام ہے ـــــ بچاری چاچی ـــــ ہائے اب وہ کبھی نہ ملیں گی ـــــ"

وہ رونے لگی ـــــ ثریا کے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر ہنڈ پھر کر وہی مسئلہ چھڑ گیا کہ ان کی اولاد ان سے کیوں اتنی بیگانہ ہے!

"سروج یہ صرف ان کی اولاد کی ہی بات نہیں ـــــ آج کل تو یہ رنگ عام ہے۔ ہر ایک کو فکر ہے اپنا اسٹینڈرڈ آف لونگ بڑھانے کی! سماج میں سٹیٹس حاصل کرنے کی ـــــ اب اگر ماں باپ اور غریب عزیزوں اور بزرگوں کی خدمت کریں۔ ان پر خرچ کریں تو یہ نیک کام کیسے ہو؟ دراصل قدریں بدل گئی ہیں ـــــ فیملی کے معنی 'بس میں اور میرے بیوی بچے' تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں ـــــ"

"ہاں یہ زہریلے اثرات اپر کلاس سے شروع ہوئے' مڈل کلاس اپنا رہی ہے اور کچھ کچھ اثر غریب طبقے پر پڑ رہا ہے ـــــ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے لوگوں کو چین کیسے آتا ہے؟"

"ہاں بہن مجھے بھی یہی حیرت ہوتی ہے ـــــ میں دفتر جاتی ہوں تو دل پورے وقت خالہ امی میں پڑا رہتا ہے۔ تھکی ہاری واپس آتی ہوں تو گھر کے کام کے ساتھ ان کی خدمت میں لگ جاتی ہوں۔ چھٹیوں میں سسرال جاتی ہوں تو امی اور پاپا کو جتنا آرام دے سکتی ہوں دیتی ہوں ـــــ میں نے تو امی کی خوشی پر اپنی بچی کو بھی ان کے پاس چھوڑ دیا ہے ..... ظاہر ہے کہ ان کا دل بہلتا ہے اور میری ذمہ داری کم ہوتی ہے ـــــ"

"اور بھابی بڑے لوگوں ـــــ بزرگ لوگوں کے پاس بیٹھ کر ان کی سیوا کر کے ان کا دکھ درد بٹا کر دل کو جو شانتی ملتی ہے ـــــ کیا ہزاروں روپیہ خرچ کر کے یا تفریح کر کے مل سکتی ہے؟"

"میرا تو یہ خیال نہیں — ان کا سایہ خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ ان کی تیمارداری اور خدمت میں جسمانی تکلیف کیسی ہی ہو مگر روحانی سکون تو مل جاتا ہے — ان لوگوں کو کیا ملتا ہوگا — میں نے تو ایسے لوگوں کو بہوت کا رونا ہی روتے سنا —"

"جی ہاں جتنا زیادہ پیسہ والا ہوگا، اتنا ہی دُکھڑا زیادہ روئے گا۔ اتنے ہی پیسے کی ہوس بڑھتی جائے گی۔ چاہے وہ بلیک مارکیٹ سے ملے — یا گندے کاروبار سے، یا دوسرے ملکوں میں جاکر تکلیف اور ذلت کی زندگی گزار کر ملے، مگر پیسہ ہو — پیسہ ہو —"

"ہاں پیسہ کی یہی تو خوبی ہے۔ سائیکل سے اسکوٹر، پھر موٹر — اور پھر اور زیادہ بڑھیا موٹر کی ہوس ہوتی ہے۔ ٹی۔ وی ہو — فریج ہو۔ ککنگ رینج ہوں۔ قیمتی سے قیمتی کپڑے روز بنتے رہیں۔ زیورات سے کبھی جی نہیں بھرتا — سفر ہوائی جہاز سے نیچے نہ ہونا چاہیے — دوسرے ملکوں کی سیر ضروری ہے — پھر کلب، ڈانس، اب میری نند ہی کو دیکھو — بھائی نے تو ماں باپ کو چھوڑنا گوارا نہ کیا اور وہ اڑ گئیں ولایت اور بڑی شان سے لکھتی ہیں۔ موٹر خرید لی ہے۔ فلیٹ لے لیا ہے۔ یہ ہے۔ وہ ہے۔ بھیا آپ بھی آجائیے۔ امی ابو کے پاس ہم نوکر رکھا دیں گے!"

"جانے بھابی کیسے چین آتا ہے ایسے لوگوں کو۔ میں تو ممی اور پاپا کو دو ہفتے نہ دیکھوں تو بے چین بے قرار ہو جاتی ہوں!"

"بی بی تم جیسی لڑکیوں کے ہوتے کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان میں پرانی قدریں ختم ہو رہی ہیں —"

"اور آپ جیسی بہوؤں پر اس ملک کو ناز ہے۔"

"بس بھئی یہ نہ کرو — من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو —"

"فارسی تو بولو نہیں مجھ سے۔ مگر بھابی۔ آپ جانتی ہیں ہم جیسے لوگوں

کو کیا سمجھا جاتا ہے ـــــ ابنارمل۔ کریزی، پاگل سمجھتے ہیں۔ میرے کولیگ، میری سہیلیاں، میرے کزن ـــــ کہتے ہیں ہر وقت ممی پاپا، ممی پاپا ـــــ ارے اپنی زندگی آپ بناؤ ـــــ میرے ایک دوست ڈاکٹر نے مجھے پرپوز کیا ہے....." ثریا نے بات کاٹی "سچ؟"

"ہاں بھابی ـــــ مگر میں نے انکار کر دیا ـــــ"

"کیوں؟"

"وہ باہر جا رہے ہیں۔ مجھے بھی لے جانا چاہتے ہیں ـــــ مجھے وہ پسند ہیں ـــــ اتنے پسند کہ اگر ان سے شادی کر سکتی تو اپنے کو بہت لکی سمجھتی مگر....."

"مگر...؟"

"مگر میں نے کہا تم ہندستان میں رہو تو مجھے تمہارا آفر قبول ہے ورنہ نہیں ـــــ" اس کی آواز بھرّا گئی۔

ثریّا نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں ـــــ "سروج پیاری، تم کتنی اچھی ہو۔"

"میں ممی پاپا کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی ـــــ میرے سوا ان کا اور ہے بھی کون ـــــ"

"تبھی تو کہتی ہوں ـــــ تیری جیسی بیٹیاں ـــــ ہندستان کی لاج ہیں ـــــ"

"پھر بھی بھابی ـــــ تم سے دل کی بات کہتی ہوں۔ کبھی کبھی دل بہت گھبراتا ہے۔ جی چاہتا ہے ـــــ میرا بھی گھر ہو ـــــ ساتھی ہو ـــــ بچے ہوں ـــــ مگر....."

"بہن تیری سیکری فائس رائیگاں نہیں جائے گی ـــــ تجھے ضرور ایسا شوہر ملے گا ـــــ ایک دو کو ٹھکرا دیا تو کیا ہوا ـــــ ایسے لوگ بھی ہیں اس دنیا میں جو سیرت کا حسن دیکھتے ہیں۔ ایثار اور سیوا کی لگن کی قدر کر سکتے

ہیں۔ ایسی ہستی سے محبت کر سکتے ہیں۔"

"مگر وہ میرے ماں باپ سے تو محبت نہ کریں گے۔ میری ایک دوست ہے وہ اپنے بوڑھے باپ اور مفلوج پھوپی کی دن رات خدمت کرتی تھی۔ ایسی سیوا ـــــ ایسا پریم ـــــ مگر جب بیاہ ہو گیا تو اب اس کے پتی نے آنے جانے پر پابندی لگا دی۔ زبردستی آجاتی ہے تو گھر میں لڑائی ٹھن جاتی ہے کہتے ہیں بیاہ کے بعد عورت پر پتی کا حق ہوتا ہے سسرال کی سیوا اس کا فرض ہوتا ہے! میکے کیوں بھاگا کرتی ہو ـــــ ہائے کیسی ڈرتی ہے وہ ـــــ بھابی میں ایسی صورت آنے ہی نہ دوں گی ـــــ"

ثریا کچھ بول نہ سکی۔ دردمند دل رکھتی تھی ـــ وہ سمجھ رہی تھی کہ سرج کیسی کشمکش میں مبتلا ہے ـــــ اپنے ماں باپ کو چھوڑ نہیں سکتی ـــــ دلی جذبات کو کچل نہیں سکتی ـــــ مگر پھر بھی ـــــ وہ جذبات کو کچل رہی ہے اور ماں باپ کی محبت پر اپنے کو قربان کر رہی ہے ـــــ اور ایک ـــــ ایک بیچاری مہرو چچی کی اولاد ہے ـــــ اف ـــــ کیسے بے درد ـــــ"

"لو بھابی دلی آگیا!"

گاڑی جمنا کے پل پر سے گزر رہی تھی ـــــ یہاں سے ہم دونوں ٹیکسی کرلیں گے ورنہ دیر نہ ہو جائے ـــ یا شاید ان کے لڑکے لڑکیوں کا انتظار ہو ـــــ"

"کوئی نہیں آئے گا بھابی ـــ کوئی نہیں ـــ وہ بڑی دکھی عورت تھیں کبھی کبھی ممی سے اپنا دکھ کہتی تھیں ـــــ"

ٹرین رک گئی۔ ہجوم میں سے بمشکل وہ باہر نکلیں ـــــ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا مگر شام ڈھل چکی تھی۔ انھوں نے باہر نکل کر ٹیکسی کی اور اپنی منزل کا نام لے کر تیز چلنے کی فرمائش کر کے بیٹھ گئیں۔

(۱۱)

آج شاہین کا برتھ ڈے تھا۔ تیسرے پہر کی پارٹی میں بہت لوگ آئے تھے اور رات کو ڈنر پر چند خاص دوست آنے والے تھے۔ رازی اس کا شوہر لاہور سے ہوائی جہاز سے آج ہی پہنچا تھا اور کانونٹ سے اس کا بچہ یوسف جس کو وہ پیار سے "جوزف" کہتی تھی صبح ہی آگیا تھا۔

کچھ عرصہ ہوا وہ لوگ باہر سے پاکستان آگئے تھے۔ یہاں رازی کو بہت اچھی "جاب" مل گئی تھی۔ مگر اسے بار بار لاہور اور اسلام آباد جانا پڑتا تھا۔ شاہین باہر کے ملکوں کی سخت زندگی سے تھک چکی تھی اور اب وہ باہر کے ملک میں کمائی دولت سے اپنے دیس میں آکر سچ مچ عیش کی زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ ایک بہت خوب صورت، ماڈرن کوٹھی کئی لاکھ کی، سوسائٹی میں خریدلی تھی۔ اور شاہین کے شوق سے اس کے اردگرد چھوٹا سا حسین باغیچہ بھی پروان چڑھ رہا تھا جس میں رنگ برنگے پھول کھل رہے تھے اور پھلوں کے ننھے ننھے پودے بڑھ رہے تھے —— سال بھر میں اس گھر کو اس نے اپنے نزدیک جنت سے زیادہ خوب صورت اور آرام دہ بنا لیا تھا۔ قیمتی اور ماڈرن

فرنیچر ۔۔۔ جالی اور ریشمی فارن کے کپڑے کے پردے، کشمیری اور ایرانی قالین ۔۔۔ دیواروں پر اعلیٰ پائے کی کلاسیکل اور ماڈرن پینٹنگ کے ساتھ ساتھ خود اس کی پینٹنگس لگی ہوئی تھیں۔ دو کمرے ایرکنڈیشنڈ تھے۔ موٹر بالکل نئی اور بڑی شان دار تھی جو وہ امریکہ سے لائے تھے اسی طرح دوسرا سامان بھی باہر کا تھا۔ ٹی۔ وی۔ ٹیپ ریکارڈ، ریکارڈ پلیئر، کچن کا سارا کا سارا سامان بجلی کا ۔۔۔ اور پھر ہندوستان اور پاکستان کی آرٹسٹک قیمتی اشیائے سجاوٹ ۔۔۔ جو بھی آتا اس کے حسن ذوق اور گھر اور بارغ کی دل کھول کر تعریفیں کرتا ۔۔۔ عورتیں ضرور جلتی تھیں ۔۔۔ مگر جلا کریں ۔۔۔ ان کا تو کام ہے حسد کرنا ۔۔۔ یہ سوچ کر شاہین کچھ خوش ہی ہوتی ۔۔۔ کل وہ دوسروں پر رشک کرتی تھی ۔۔۔ آج لوگ اس سے حسد کرتے ہیں مسٹر رازی باغ میں اپنے دوستوں سے گپ شپ کر رہے تھے بدیسی مہنگی شراب کا دور چل رہا تھا ۔۔۔ شاہین ابھی تک اس شوق میں ان کی شریک نہ ہو سکی تھی۔ وہ کلب جاتی ۔۔۔ ڈانس کرتی۔ پارٹیوں میں بے تکلف نیم برہنہ ماڈرن لباس پہن کر شرکت کرتی ۔۔۔ اکیلی سیر تفریح کرتی ۔۔۔ مگر شراب سے جو بچپن سے نفرت تھی ۔۔۔ اسے وہ دل سے نہ نکال سکی تھی!

وہ اپنے بیڈ روم میں تین بیضوی شیشوں کی نہایت خوب صورت میز کے سامنے تپائی پر بیٹھی تھی۔ سنگار میز پر سیکڑوں شیشیاں اور ڈبیاں ہر قسم کے سامانِ آرائش اور بدیسی ہی سینٹ کی خوب صورت شیشیوں اور بوتلوں سے یہاں سے وہاں تک سجی تھی۔ ڈبل بڈ پر موٹے ڈنلپ پلو کے اوپر چکنی کام کا بڈ کور پڑا ہوا تھا ۔۔۔ اور سائڈ کی دونوں میزوں پر ہاتھی دانت اور سنگ مرمر کے لیمپ رکھے تھے۔ ایک لیمپ "نیفا طیطی" کے سر اور اوپر کے بدن کی صورت کا تھا اور دوسرا چاندی اور سونے کا جس کو قلوپطرہ کی شکل میں

ڈھالا گیا تھا! چھت پر بلوریں چھوٹے چھوٹے جھاڑوں میں بجلی کی موم بتیاں جل رہی تھیں ـــــ اور اس روشنی میں شاہین اپنا سنگار کر رہی تھی۔ سامنے اس کی بنارسی میکسی جو آج ہی بالکل نئے ڈیزائن کی سِل کر آئی تھی، ہینگر میں ٹنگی ہوئی تھی۔ شام کو اس نے فرنچ شیفون کی کامدار ساڑھی اور زربفت کا سلیولس بلاؤس پہنا تھا ـــــ ہیرے کا نکلس اسی کے جوڑ کی بالیاں، انگوٹھی اور چوڑیاں ـــــ ہیرے جڑی گھڑی سنگار میز پر رکھی تھیں ان کے نگ بجلی میں دمک رہے تھے۔

تو آج وہ پینتیس سال کی ہو گئی ـــــ اگرچہ اس کی سال گرہ تیسویں ہی تھیں ـــــ اس کے سٹ کیے ہوئے بالوں میں کوئی سفید لٹ نہیں ہے۔ چہرے پر کوئی جھرّی نہیں ہے ـــــ مگر پھر بھی وہ اپنے کو کچھ تھکا ہوا محسوس کرتی ہے ـــــ مگر تھکن ـــــ یہ تو حسن اور جوانی کے لیے زہر ہے ـــــ کیا بات ہے ـــــ وہ کیوں اداس ہے ـــــ کیوں پریشان ہے ـــــ

اچانک خیال آیا جانے اماں کیسی ہیں؟

چھ مہینے پہلے اماں کے فالج کی خبر سن کر اس نے ویزا کی درخواست دی تھی اور ادھر مہینہ بھر پہلے مل بھی گیا تھا۔ مگر پھر خبر ملی کہ اب اماں اچھی ہیں گھر آ گئی ہیں۔ اس نے سوچا ذرا اطمینان سے جاؤں گی جب رازی بھی ساتھ جا سکے۔ اور ہفتے بھر پہلے پھر تار ملا کہ اماں کی طبیعت پھر خراب ہو گئی۔ کاش جلدی جا سکے۔ وہ تو اسی وقت تیار تھی مگر رازی اور سب دوستوں کا اصرار تھا کہ سال گرہ کے بعد جانا ـــــ رک تو گئی مگر دل اندر سے بے چین ہے بس اب کل سے ہی کوشش شروع کر دی جائے اور دو چار دن میں روانہ ہوا ہی جائے۔

"تار بھی تو اختر چچا نے دیا تھا۔ ابو نے تو نہ تار دیا نہ خط لکھا۔ وہ تو مجھ سے ناراض ہی ہیں۔ ان کی بیماری میں جب گئی تھی، کتنے ہزار روپے

خرچ کر کے میں اور بچہ گئے ـــــ مگر وہاں سے دل پر صدمہ ہی لے کر آئی۔
ہوٹل میں ٹھہرنا ایسا جرم تو نہیں کہ ماں باپ صورت سے بیزار ہو جائیں۔ ابو
اسپتال میں تھے۔ امی ان کے پاس رہتی تھیں۔ اب میں اس پرانی وضع
کے گھر میں جہاں فلش کا باتھ روم تک نہیں، کیسے رہتی؟ اتنے دن میں عادت
ہی نہیں رہی ان پرانے قسم کے گھروں میں رہنے اور گندے پاخانوں کے
استعمال کی ـــــ اگر ابو کی خدمت کر سکتی تب بھی ایک بات تھی۔ مگر ہماری امی
تو ابو کو اپنی ملکیت سمجھتی رہیں سدا ـــــ میں نے دو چار بار کہا امی آپ گھر
جا کر رہیے ـــــ میں ابو کے پاس دو چار دن رہ جاؤں گی، مگر وہ نہیں مانیں
ـــــ تو پھر کیا کرتی ـــــ ہوٹل میں بچہ کی وجہ سے بھی تو رہنا ضروری تھا
ـــــ وہ کیسے رہ سکتا تھا اور پھر مجھی کو دیکھ بھال کرنی تھی اس کی ـــــ
امی اور ابو ـــــ وہ تو جیسے مجھے بھول ہی گئے ـــــ میں جس نے اتنی
خدمت کی۔ اتنی محبت کی! مگر میرا رازی سے بیاہ کرنا ان کو اچھا نہیں
لگا تھا نا ـــــ ارے روپے تک تو لیے نہیں۔ امی نے الٹے منھ پر مار
دیے ـــــ "تیرے میاں کی دولت ہمیں نہیں چاہیے ـــــ داماد کا
احسان میرے ہاں نہیں لیا جاتا ـــــ" یہ بھی خوب بات ہے۔ ان کا پیسہ
میرا پیسہ ہے ـــــ میں جسے چاہوں دوں ـــــ اصل میں نہ انھیں رازی
پسند تھا اور نہ یہ چاہتے تھے کہ ان کے پاس سے میں کہیں اور جاؤں۔
اسی لیے تو میرا نازش سے بیاہ کرنا چاہتے تھے ـــــ وہ احمق تو بیاہ کے بعد
بھی مجھے ان کے پاس چھوڑ دیتا ـــــ اب یہ زبردستی کوئی کیسے برداشت
کر سکتا تھا ـــــ کہاں نازش ـــــ کہاں رازی ـــــ آج میں جو کچھ ہوں
رازی ہی کی وجہ سے تو ہوں ـــــ اسی ڈلہوزی گسٹ ـــــ نازش سے شادی
کر کے ساری زندگی مصیبت اور پریشانی میں گزارتی ـــــ چار سو روپے
تو میرے ڈرائیور کی تنخواہ ہے آج! اور اس کی شاید سات آٹھ سو

ہو گی ـــــ اصل میں ابو اور امی کے دل سے میری محبت ہی ختم ہو چکی ہے۔"

"ایک آہ اس کے لبوں سے بے اختیار نکل گئی ـــــ آئینے میں بھاری میک اپ سے لپا پتا چہرہ، منڈی بھوؤں پر پنسل سے بنی باریک کمان کی شکل تی بھوؤں کے نیچے، سیاہ آنکھوں اور سیاہ تراشیدہ سٹ کیے ہوئے بالوں والی حسینہ اسے تک رہی تھی!

اور پھر اس نے پلٹ کر سامنے کی دیوار پر ایک قدِ آدم تصویر کو دیکھا اور نظر وہیں جم کر رہ گئی ـــــ اس تصویر میں ایک نوجوان معصوم سی دوشیزہ، تنگ پاجامہ، پھنسا کرتا اور رسی کی طرح گلے میں لپٹا دوپٹہ ہاتھوں میں باریک چوڑیاں پہنے کھڑی مسکرا رہی تھی ـــــ بائیں ہاتھ کے بڑھے ہوئے ناخنوں پر کیوٹکس لگا تھا اور ایک چھوٹے سفید نگ کی سونے کی انگوٹھی چھنگلی میں نظر آ رہی تھی ـــــ مگر ان آنکھوں میں جو چمک اور جان ہے، ان ہونٹوں پر جو بے ساختہ مسکراہٹ ہے، ان گھنی بھوؤں میں جو خدا داد دلکشی ہے ـــــ جسم میں جو تناسب ہے، وہ اب خود اس میں باقی کیوں نہیں رہا؟

یہ تصویر اس نے آئینے کے سامنے بیٹھ کر بنائی تھی۔ اماں کی پرانی سنگار میز کا آئینہ جس کا ایک کونا ٹوٹ گیا تھا اور فریم میں زنگ لگا ہوا تھا۔

اس نے اماں سے چھپ کر اور ابا میاں سے منظوری لے کر یہ تصویر ایک آرٹ اگزیبیشن میں رکھوا دی تھی ـــــ اس کی بدولت اسے صرف انعام ہی نہیں ملا ـــــ رازی بھی مل گیا ـــــ وہیں نمائش میں ہی تو اس کی ملاقات رازی سے ہوئی تھی۔ وہ اس کا پرانا کلاس فیلو تھا بی۔ اے کر کے وہ ولایت چلا گیا تھا اور اس نے آرٹ کا ڈپلوما کر کے نوکری کر لی تھی ـــــ کہ گھر کا خرچ چلا سکے۔

رازی سے اس کی تھوڑی سی دوستی تھی۔ محبت تو نہ تھی ــــ ہاں
جب یہ پتا چلا کہ وہ لندن جا رہا ہے۔ اس کے ایک دوست نے اس کا داخلہ
کرا دیا ہے، ذمہ داری لے لی ہے ــــ تو اسے بڑا رشک محسوس ہوا تھا۔
کاش وہ بھی جا سکتی۔ دنیا کی سیر کر سکتی۔ پھر وہاں جا کر تو وہ خود بہت
کما سکے گی۔ مگر سوائے اپنی محرومی پہ کڑھنے کے اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔
ایک معمولی سی نوکری کر لی اور ــــ گھر پر تصویر کشی کا شوق جاری رکھا۔
اسی شوق کی بدولت اس نے اپنی یہ تصویر بنائی تھی جو بہت ہی اچھی
بن گئی تھی۔ لوگوں نے بڑی تعریف بھی کی تھی۔ ایک ٹیچر نے اصرار کیا کہ اسے
ایگزیبیشن میں رکھو۔ ابو راضی ہو گئے۔ امی تو کبھی نہ ہوتیں۔

ایک دن اس نے دیکھا ایک سوٹڈ بوٹڈ اسمارٹ سا شخص کھڑا بڑے
غور سے اس کی تصویر دیکھ رہا ہے ــــ اس نے قریب سے دیکھا تو وہ
رازی نکلا ــــ اُفوہ! کیا ٹھاٹ ہیں۔ قیمتی گھڑی، جیب میں سونے کے
قلم کی جھلک ــــ پورا لباس بیش قیمت، ہاتھ میں انگوٹھی ــــ شاید
ہیرے کی ہے ــــ اس نے ہیرا کبھی دیکھا بھی تو نہیں تھا مگر امیٹیشن ہیرا
بھی اس کو بہت اچھا لگتا تھا۔

رازی نے گھوم کر دیکھا ــــ تصویر والی خود مجسم تصویر بنی اس کے
پیچھے کھڑی تھی۔ وہی لباس، وہی مسکراہٹ، وہی کافر شباب اور وہی
دلکش انداز ــــ تصویر زندہ ہو گئی تھی!

"ہلو شاہین ــــ"

"ہلو رازی ــــ"

"تم تو بڑی آرٹسٹ بن گئی ہو ــــ اور پہلے سے بھی زیادہ حسین
ہو گئی ہو ــــ ونڈرفل ــــ"

شاہین کی نظر تصویر سے پھر شیشے پر پڑی ــــ

یہ لباس ۔ یہ زیور ۔ یہ ٹھاٹ باٹ، یہ عیش و آرام اسی تصویر کی بدولت اسے ملے ہیں۔ وہ مجھ پر نہیں میری تصویر پر عاشق ہوا تھا ۔ اور وہ خود ۔ ہاں ۔ جانے کہاں سے اسے ایک دم رازی سے محبت پھوٹ پڑی تھی ۔ کتنی مخالفت، لعن طعن، اسے برداشت کرنے پڑے تھے ۔ اماں سے تو اسے اندیشہ تھا مگر وہاں تو ابا میاں اڑ گئے تھے ... وہ کہتے تھے ہمارے جوڑ کا نہیں۔ ہمارے مذہب کا نہیں ۔ انھیں اس کے خاندان پر، اس کی ذات پر اعتراض تھا امی کو فکر تھی کہ وہ ولایت جا کر اس کو چھوڑ نہ دے ۔ دھوکا نہ دے ۔ کچھ نہیں یہ سب باتیں تھیں۔ وہ دونوں اس کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ بھائی جان نے کچھ بھیجنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ غزالی بھائی سے لڑائی ہو گئی تھی۔ حالاں کہ ان کی خاطر تو ابو میاں نے پنشن بھی آدھی بیچ ڈالی تھی۔ بھائی جان کے لیے باغ بیچ دیا۔ جو کچھ بھروسہ تھا وہ میری تنخواہ پر تھا ان دونوں کی بیماریوں کے خرچ تھے کہ بڑھتے ہی جا رہے تھے ۔ ہاں ۔ میں نے سوچا تو یہی تھا کہ ان دونوں کی خدمت کروں گی ۔ مگر نازش جیسے بدھو سے بیاہ ۔ نہیں! جسے نہ آگے بڑھنے کی لگن ہے نہ باہر کسی ملک میں جانے کا شوق ۔ بس جو ہے وہ اپنا وطن ۔ اپنے بزرگ۔ اپنے مقاصد ۔ ہنھ دنیا میں بغیر روپے کے کیا ہوتا ہے۔ یہ خالی خولی باتیں ہیں! اور رازی کو دیکھ کر ۔ اس کی باتیں سن کر، اس کی محبت، اور چاہت میں ڈوب کر مجھے لگا کہ زندگی کس چیز کا نام ہے۔ اس نے تیسری چوتھی ملاقات میں پروپوز کر دیا۔ اور جلد سے جلد وہ شادی کر کے واپس جانا چاہتا تھا۔ اب ایسا سنہری موقع وہ کیسے چھوڑ دیتی ؟ بھائی جان، بھیا، باجی کسی کا فرض نہیں؟ سب کے فرض اٹھانے کے لیے وہی رہ گئی ہے۔ ان لوگوں کے لیے سب کچھ کیا ۔ میرے لیے کیا کیا ۔ امی ابو کہتے تھے۔ اس

کے دو کماؤ بھائی ہیں۔ شان سے شادی کریں گے .... بڑی شادی کی نا — وہ تو اماں نے کسی طرح ابا میاں کو راضی کر لیا ورنہ کورٹ میں جا کر ہم نے تو بیاہ کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا — اور رہا بھی کیا۔ امی کے پاس پانچ سات جوڑے اور تھوڑا سا زیور — میں نے تو کہہ دیا تھا، اس کی بھی ضرورت نہیں — رازی کے پاس سب کچھ ہے! اس پر بگڑ گئیں — بگڑ ہی — غصہ تو اس پر آیا — ہسٹیریا میں کہہ بھی گئیں کہ سب نے ساتھ چھوڑ دیا تو بھی چھوڑ دے گی — خود عمر بھر عیش کیے — آج بھی اماں اور ابا میاں ایک دوسرے سے کس قدر محبت کرتے ہیں — بھلا میں کیسے ایسی آرام و آسائش کی زندگی۔ اور رازی جیسے اسمارٹ اور دولت مند کو ٹھکرا دیتی — ہر کوئی اپنا بھلا دیکھتا ہے اس دنیا میں — یہ تو میری خوش قسمتی تھی — جانے میری کیا ادا اسے بھا گئی — ورنہ اس کو تو ایک سے ایک بڑے گھر کی دولت مند اور حسین لڑکیاں مل رہی تھیں —

یہ میرا عزم اور ارادہ تھا جس نے سب کو جھکا دیا۔ اب میرے پاس کیا نہیں ہے! پانچ سال امریکہ اور دوسرے ملکوں میں گزارے۔ رازی پاکستان واپس آئے تو یہاں بھی عیش و آرام ہے — بلکہ زیادہ ہی آرام ہے وہاں رہتی نیوڈانسوںnewdancers کے بیچ زندگی گزرتی! اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا — بچاروں کی اتنی عمر ہو گئی بیماریاں ہیں تنہائی ہے، پیسے کی تنگی ہے — مگر غرور — ہاں میں تو غرور ہی سمجھتی ہوں، چاہے وہ اسے خودداری کہیں یا قناعت — آخر کیا برائی ہے جو وہ کچھ روپیہ ہم سے لے لیا کریں — میرا میاں اتنا خیال تو کرتا ہے ان کا دوسرا داماد — اور داماد کیا بیٹے بھی — ان کو پوچھتے نہیں کچھ دیتے نہیں — کس قدر مجھے صدمہ ہوا ہے۔ جانے یہ کیسے اللہ میاں

ہیں کہ اتنی بڑی بڑی عمریں دے کر مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں ——— ہمیں تو جوانی ہی میں موت آجائے تو اچھا ہے ——— کم سے کم کسی پر بار تو نہ ہوں گے ——— اور کون کرے گا خدمت ہماری؟ ہم نے کیا پھر بھی برسوں ان کی خدمت کی!"

اچانک کسی نے اندر سے ٹھوکا دیا ——— کیا موت اور زندگی پر بھی کسی کا اختیار رہے ——— کیا اللہ میاں سے کوئی گارنٹی کی جا سکتی ہے ——— کہ بڈھے نہ ہوں ——— بیمار نہ ہوں ——— مگر خودکشی تو کی جا سکتی ہے ——— لیکن اگر موت نہ آنی ہو تو خودکشی بھی تو کامیاب نہیں ہوتی ———

اس نے جھلا کر سر کو جھٹکا دیا ——— آج خوشی کے دن یہ کیسے خیالات آرہے ہیں ——— مہمان آنے والے ہوں گے ——— وہ بھی نیچے انتظار کر رہے ہیں ——— وہ انہماک سے میک اپ کو آخری ٹچ دینے لگی ......

جب سے اس کمبخت نے نوکری چھوڑی ہے سارا کام کرنا پڑتا ہے ——— لباس نکالنا، بال سٹ کرنا، غسل کرنا، میک اپ ——— چار سو روپیے پر لات مار کر چلی گئی، زیبا حرام خور ——— اتنی بڑی تنخواہ اور آنے جانے کا آٹھ دس ہزار روپیہ خرچ کر کے اسے وہاں بلا کر رکھا تھا ——— مگر اب خوب روپیہ جمع ہو گیا نا ——— اماں باوا کو بیاہ کرنا ہے ——— ہنھ ——— کبھی جو وفا کریں یہ لوگ ——— کتنے پیار سے رکھا تھا میں نے اسے ——— تھی تو وہ رازی کی دور کے رشتے کی کزن ——— مگر آرام بھی اس نے مجھے دیا ——— بچہ کو پالا، گھر کا کام کیا ——— وہاں اور کسی کے پاس بھی ایسا نوکر نہ تھا ——— خیر کیا ہوا تھی تو نوکر ——— جس کو تنخواہ دو خرچ اٹھاؤ وہ نوکر نہیں تو کیا ہوتا ہے ——— پھر بھی ہم سوسائٹی میں اس کو کزن کہہ کر ہی انٹروڈیوس کراتے تھے ——— یہاں بھی کئی مہینے رہی ——— مگر روپیہ کی گرمی چڑھ گئی تھی ——— روپے کی گرمی؟ روپے کی گرمی تو بھی

کو ـــــ ہنہ کیسے خیالات آج اسے پریشان کر رہے ہیں۔

ہزاروں روپے دیے۔ کپڑا دیا ـــ زیور دیا ـــ دنیا بھر کی چیزیں ـــ وہ دو سو روپلّی کا نوکر لونڈا اسے کیا آرام سے رکھے گا؟ بڑی خود غرض ہے یہ دنیا ـــ

واقعی بڑی خود غرض ہے ـــ ہم کیا اپنے ماں باپ کا بھی خیال نہیں کرتے لوگ۔

ماں باپ ۔؟ کس کے ماں باپ ۔؟ کون خیال نہیں کرتا؟ یہ کیسی آواز ہے ـــ یہ کون بول رہا ہے ـــ اس نے گھوم کر چاروں طرف دیکھا ـــ کوئی باہر بول رہا ہو گا...

نک سک سے درست ہو کر سفید زربفت کی میکسی اور ہیرے کے زیوروں میں جگمگاتی وہ باہر جانے کے لیے مڑی ـــ راز ی کیا آج تو سارے لوگ بس اسے دیکھتے رہ جائیں گے....

اس کا پانچ سال کا بچہ جوزی ـــ یوسف کو وہ پیار سے جوزی ہی تو کہتا ہے ـــ بھاگتا ہوا آیا۔

"ممی ـــ ممی ڈارلنگ ـــ ہائے سویٹ ـــ ڈارلنگ ممی ـــ"

وہ ہاتھ پھیلا کر دوڑا ـــ تو سب کچھ بھول کر اس نے بچے کو گود میں اٹھا لیا ـــ اور اس کے چہرے پر بوسوں کی بارش کر دی۔ میرا بچہ میرا لعل ـــ مائی ڈارلنگ جوزی ـــ" اس وقت نہ کپڑوں کی شکنوں کی فکر تھی نہ میک اپ کی ـــ نہ لپ اسٹک کی ـــ اس کا بچہ گلے میں جھول رہا تھا ـــ

تجھے اپنا بچہ بہت پیارا ہے ـــ ہر ماں کو ہوتا ہے ـــ مگر ـــ مگر تیری ماں؟"

خدایا یہ کیا قصہ ہے ـــ یہ کون ہے ـــ

اندر کی آوازوں کو سننا سمجھنا اس نے مدت ہوئی چھوڑ دیا تھا۔

یکایک بیرا اندر داخل ہوا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے — نوک کیے بغیر —" وہ چیخی۔

"حضور — انڈیا سے آپ کا فون —"

"فون؟ کس کا — میرا؟"

"جی میم صاحب!"

"وہ اندھا دھند دوڑی اور فون کا رسیور اٹھا لیا۔ ایک مین کنکشن فون کا نیچے آفس میں تھا اور پھر ہر کمرے میں ایک کنکشن تھا۔

"ہلو ... ہاں۔ میں شاہین بول رہی ہوں"

ذرا دیر خاموشی رہی۔

"نازش — نازش بھائی۔ کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے — اماں کیسی ہیں ... ابو کا کیا حال ہے ..... ہیں — کیا — کیا ہوا — ہائے اللہ —" اس نے رسیور چھوڑ دیا جو کہ بڑل سے الگ جھولنے لگا۔ چہرہ سفید، پھٹی آنکھیں — تیزی سے نیچے سے رازی آگیا۔ وہ بہت پیے ہوئے تھا — شاہین — ڈارلنگ — کس کا فون تھا انڈیا سے؟" جوزف جو برابر کھڑا تھا اس سے لپٹ گیا۔ "ممی۔ ممی — کچھ بولو نا ممی —"

برف کی سل میں دراڑ پڑ گئی — چٹان ٹوٹ گئی — اس نے بیٹے کو گود میں لے کر سینے سے لگا لیا — اور اس کے جھنڈولے بالوں میں منھ چھپا کر بلکنے لگی۔ "اماں — اماں — میری اماں"

اور بچہ بے سمجھے اس کے ساتھ رونے لگا۔

(۱۲)

اب دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی ـــــ ٹھنڈی دھوپ، میلی دھوپ ـــــ صحن میں کچھ عورتیں پلنگوں پہ بیٹھی تھیں، ان کی بیوی کا پان دان کھلا تھا جس میں سے کوئی پان لگا کر کھا اور کھلا رہی تھی ـــــ ان کے دل میں ایک ہوک سے اٹھی ـ اس پان دان کو وہ کسی کو بھی چھونے نہیں دیتی تھیں ـــــ صاف ستھرا، چاندی کی طرح دمکتا ہوا پاندان ـــــ جس میں ان کے پیسے بھی ہوتے تھے ـ چھوٹا موٹا زیور بھی ـــــ اور خدا جانے کیا کچھ وہ اس میں رکھتی تھیں ـــــ آج اس پان دان کی کیا، انھیں خود ان کی خبر نہیں ـــــ

وہ چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگے ـــــ یہ ان کو کیا ہو رہا ہے، یہ خدا کو یاد کرنے کا وقت ہے ـ کلام پاک پڑھنے کا موقع ہے ـــــ مگر ان کا دل کسی چیز میں نہیں لگ رہا... ابھی تک شہر سے تجہیز و تکفین کا سامان نہیں آیا تھا ـ ان کی آخری تیاری نہیں شروع ہوئی ـ کچھ نہیں اختر اور نازش جان کر دیر کر رہے ہیں ـــــ پہلے وہ اپنے اور بیوی کے مشترک کمرے کی طرف بڑھے ـــــ مگر پھر جیسے کسی نے پاؤں پکڑ لیے اور وہ گھبرا کر برابر کے کمرے میں گھس گئے ـــــ ہیرو کا ذاتی کمرہ ـــــ جس میں اس کے بکس تھے ـــــ

سامان تھا ___ اس کے پیسوں کا صندوقچہ تھا۔ نماز کی چوکی اور باترجمہ قرآن پاک تھا ___ اور ایک چھوٹی سی درازوں کی میز تھی ___ سامنے ہی ان کی قدِ آدم تصویر لگی تھی ___ شاہین کی پینٹنگ ___ ان کے دل میں درد کی ایک لہر اٹھی ___ دوسری طرف مہرو کی اور ان کی جوانی کی تصویر ___ (جو انھوں نے اماں سے چھپ کر اکٹھی کھنچوائی تھی اور انلارج کر کے بیوی کو تحفے میں دی تھی۔) دیوار پر مسکرا رہی تھی ___ میز پر البم تھا ___ البم جس کو وہ چھپ چھپ کر دیکھا کرتی تھی ___ جس میں اس کے بیٹوں کی بیبیوں تصویریں تھیں۔ بچپن کی۔ جوانی کی۔ ہندوستان کی، باہر کے ملکوں کی۔ جس میں اس کی بیٹیوں، دامادوں، نواسے، نواسیوں، پوتے پوتیوں کی تصویریں تھیں ___ تصویریں ___ ہاں اس کے مقدر میں بس یہ تصویریں ہی تو تھیں ___

سامنے ہی اس کی ایک کاپی پڑی تھی ___ ایک موٹی سی کاپی ___ جس میں کبھی جوانی میں اس نے اپنی پسند کے شعر لکھے تھے ___ کہیں کہیں کوئی ادبی ٹکڑا نقل کیا تھا ___ پھر دھوبی کے کپڑے، خطوں کے مسودے۔ آمدنی اور خرچ کا موٹا موٹا حساب ___ زمین باغ اور پنشن کے بیچنے سے جو روپے ملے تھے اور جس جس بچے کو دیے گئے تھے ___ اس کی یادداشتیں درج تھیں ___ ہاں یہ مکان انھوں نے اس کی پہلی ___ چھ سات مہینے پہلے کی بیماری میں اس سے چھپ کر گروی رکھا تھا ___ اور اسی روپے سے دلی لے جا کر اس کا کئی مہینے علاج کرایا تھا ___ اور اب بھی اتنی مہنگی دوائیں اس روپے میں سے آتی رہی تھیں ___ اس نے لاکھ پوچھا کہ یہ روپیہ کہاں سے آ رہا ہے ___ مگر انھوں نے ٹال دیا ___ مردوں کے پاس کبھی تو کچھ ہوتا ہے نا ___ تم لوگ تو زیور گڑوا کر رکھ لیتی ہو ___ ہم بیچارے وقت بے وقت کے لیے بنک میں رکھ دیتے ہیں ___ اور انھوں نے

اسے طعنہ دیا تھا ــ جب تم نے میری اتنی چاؤ سے دی ہوئی زنجیر بیچ کر میرا پھوڑے کا علاج کرایا، آنکھ کا آپریشن کرایا تو میں نے تم سے پوچھا تھا ــــ اس پر وہ مسکرا کر چپ ہو گئی تھی۔ ارے تمھاری محبت کی زنجیر میں بندھی ہوں میں تو ــ اس سونے کی زنجیر کا اور مصرف ہی کیا تھا ــ وہ یوں ہی اس کاپی کو الٹ پلٹ رہے تھے ــ کہ ایک جگہ انھیں کچھ خطوں کے مسودے نظر آئے ــ وہ ہمیشہ جب ان کو خط لکھتی تو پہلے کاپی پر لکھ لیا کرتی تھی ــ انھوں نے دو ایک بار اسے ٹوکا بھی تھا تو وہ جھینپ کر کہتی۔ غلطیاں رہ جاتی ہیں نا ــ ڈرتی ہوں تم مذاق اڑاؤ گے۔ اس کا خط نسیم کا سا خوبصورت نہ ہوتا تھا۔ عبارت آرائی شعر و شاعری نہ ہوتی تھی ــ اب کیا جوانی میں بھی ــ مگر ایک عجیب سادگی، خلوص اور اپنائیت اس کی ہر سطر میں گھلی ملی محسوس ہوتی تھی ــ

انھوں نے دو چار ورق پلٹے ــــ اوہ ــ یہ وہ خط ہے جو مہرو نے غزالی کے بارے میں انھیں لکھا تھا جب وہ دس دن کے لیے چلے گئے تھے۔ وہ خفا غزالی سے تھے اور سزا مل رہی تھی مہرو کو ــ ان کی آنکھوں میں دھندسی آگئی۔ اونی چادر سے آنکھیں صاف کیں! خط پر گیارہ برس پہلے کی تاریخ تھی۔

میرے سیاں ـ سلامت رہو!

تمھارا خط میں نے پڑھا ـ ایک بار نہیں کئی بار ـ غزالی میاں کی ضد غلط ہے ـــ مجھے بھی رنج ہے ـــ مگر یہاں۔ بچوں کی ضد کے آگے بڑوں کو جھکنا ہی پڑتا ہے ــ پھر یہ ضد بھی کوئی ایسی نہیں ـــ کوئی برا کام تو وہ نہیں کر رہا ہے ـــ آج کل سبھی جوان لڑکوں کو ولایت جانے کا شوق ہے ـ آرزو ہے ــ اسے بھی یہ خواہش ہے تو کیا غضب ہے

ہمارے پاکستان کے کتنے عزیز اور ان کے بچے ولایت کے ملکوں میں جا رہے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں کما رہے ہیں اور گھر اتنا روپیہ بھیجتے ہیں کہ پورا خاندان عیش کرتا ہے۔ تم یہ کیوں سمجھتے ہو کہ غزالی بگڑ جائے گا۔ ارے بھئی وہ اور اونچی ڈگری لینا چاہتا ہے ـــ وہ چھوٹے خاں یاد ہیں جن کی میرٹھ میں سروتے قینچی کی دکان تھی اور جو ہجرت کر پاکستان گئے۔ تھوڑی بہت جائیداد اور گھر وغیرہ مل گیا ہوگا۔ اپنے بچوں کو پڑھایا لکھایا۔ وہاں جا کر انھوں نے کہا کہ وہ ایک بڑے زمین دار تھے ـــ خان بہادر صاحب کہلاتے تھے ـــ پھر جانے کیسے دو بیٹے لندن چلے گئے ـــ ایک بجلی کا کام کرتا ہے ـــ دوسرا کچھ اور کرتا ہوگا۔ دونوں نے باپ کو خوب روپیہ بھیجا ـــ اب اچھی اچھی جگہ لڑکیوں کی شادیاں کر دی ہیں! جس ٹھاٹ سے وہ میاں بیوی ولایتی کپڑے پہن کر اتراتے ہیں سچ کہوں مجھے تو ہنسی آ جاتی ہے ـــ خوب اچھا گھر بنا لیا ہے ـــ گھر کے اندر وہ ٹھنڈی مشین' ارے وہی فرج۔ اور وہ ٹیلی ویژن کی مشین بھی ہے۔ اور تو اور موٹر بھی لے لی ہے۔ مگر پرانی ہے ـــ اور جانے کیا کیا ہے۔ ہے ہے ہے.. کیسی شیخی بگھارا رہی تھیں.. وہ قینچی اور سروتے والی بیگم ـــ ہندوستان میں بھی کتنے لوگ جاتے ہیں۔ یہ نہ سمجھنا مجھے اپنے یا تمھارے بیٹے پیسے کی چاہ ہے۔ ارے ہمارے پاس کیا نہیں۔ گھر ہے ـــ زمین ہے ـــ تمھاری پنشن ہے مگر ـــ بس اب آدھی پنشن بیچ ڈالو اور زمین گروی رکھ دو غزالی کا کرایہ اور ایک سال کا خرچ نکل آئے گا ـــ پھر وہ روپیہ بھیجے گا تو زمین چھڑوا لیں گے۔ تنخواہ بھی تو کچھ [illegible] کر ہی دے ہے ـــ غزالی سے کہیں گے شاہین کے بیاہ کے لیے روپیہ جمع کر کے بھیجے ـــ وہ اب خیر سے بیس سے نکل گئی

ہے، اس کی فکر نہیں کرنی ہے؟"

تم ٹھیک کہو ہو کہ ننو پر تے بھی تو وعدے کیے تھے۔ باغ اس کی کھینٹ چڑھا — جو بنک میں روپیہ تھا وہ کبھی اسے دے دیا — اور اب وہ وہاں مزے اڑا رہا ہے — مگر — یہ ننو کا قصور نہیں۔ یہ سب اس کی لاڈلی بیوی کی حرکتیں ہیں۔ یہ اسے گھرانے کی پیسے والی خاندان کی لڑکی لانے کا ہی نتیجہ ہو ہے — تم کہو گے یہ بھی میرا ہی قصور رہے — پھر کیا کرتی۔ بیٹے کی ضد تو پوری کرنی تھی — وہ میاں کو تم سے ملنے نہیں دینا چاہتی — مگر غزالی کی بات اور ہے میاں! غزالی کہے ہے 'آج کے زمانے میں پیسے ہی سے عزت ملے ہے، عیش آرام ملے ہے — اچھی بیوی' اچھا گھر — میں جانوں ہوں یہ سب باتیں غلط ہیں — خدا پر بھروسہ اور قناعت سے بڑی بھی کوئی دولت ہے —؟ اس کی بدولت ہم نے کم پیسے میں راج کیا ہے — مگر ہمارا زمانہ اور تھا — یہ لوگ کہاں ان باتوں کو سمجھتے ہیں — ارے مانتے ہی نہیں — ہم تو اپنا جی مارکے، ماں جی — اور دوسرے اپنے ضرورتمند رشتہ داروں کا خیال کریں تھے — اب بھی اللہ کا شکر ہے چار کو کھلا کر کھاتے ہیں — ہمارا یہ عقیدہ تھا۔ تھا کیا اب بھی ہے کہ کسی کو دینے سے کمی نہیں ہو ہے — اللہ اور برکت دے ہے۔ میرا بیاہ ہوا تو تم نوکر بھی نہ تھے — پھر ڈیڑھ سو کی نوکری ملی — اور اللہ نے کیا ہر امتحان میں پاس ہوتے گئے۔ تحصیلدار ہوئے۔ ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ کبھی ایک پیسہ حرام کا گھر میں نہیں آیا پھر بھی برکت ہی برکت رہی۔ اچھا کھایا' اچھا پہنا' ہاں ہوس نہ تھی — مگر یہ آج کل کے لڑکے — توبہ ہے! میاں رنج تجھے بھی ہے۔ حسرت تھی کہ ایک لڑکا تو پاس رہے گا۔ مرنے جینے کا کیا بھروسہ — بیماری کاہلی میں اپنا بیٹا ہی تو کام آتا ہے — مگر

یہ آج کل کے لوگ! ارے کیسے ماں باپ۔۔۔ کیسا وطن اور رشتے دار۔۔۔ وہاں تو خدا بھی پیسہ ہی ہے۔۔۔ ہم تم چلتی گاڑی کو کیسے روکیں گے۔ زمانہ کی ہوا کو کون روک سکے ہے۔۔۔ غزالی دنیا سے الگ کوئی بات نہیں کر رہا۔ کہے ہے چار سال بعد واپس آؤں گا۔۔۔ ہم اپنے بچوں کی سلامتی کی دعائیں یہ وقت کاٹ لیں گے سیّاں۔ پھر ہماری بٹیا شاہین ہے۔۔۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ تم ہو خیر سے میرے سر پر۔۔۔ اور میں ہوں تمھاری خدمت کرنے والی

۔۔۔ اچھا تو غصہ تھوک دو۔۔۔ سیّاں۔۔۔ ہماری عزت اور محبت اسی میں ہے کہ ان کی ضدوں کو اپنالیں اور یہ ظاہر کریں کہ ہم خوش ہیں! نہیں تو کس کم نصیب کا دل چاہتا ہے کہ اولاد سے دور رہے! گھنٹوں اس نے مجھ سے بحث کی۔۔۔ تم سے بھی کر چکا ہے۔ اب اگر اس نے تم سے زبان چلائی تو؟ شاہین بھی تمھاری طرح چھوٹے بھیا سے ناراض ہے۔ خوب لڑی۔ کہے ہے یہ سب دور کے ڈھول ہیں جو سہاونے لگے ہیں۔ دولت کی خاطر کیا اپنا دیس، اپنا گھر، اپنے ماں باپ بھائی بہن کو چھوڑ دے آدمی! وہ تو کہے ہے یہ لوگ وہاں جاکر ہوٹلوں میں کام کریں ہیں۔ موٹریں دھوویں ہیں۔ کارخانوں میں مزدوریاں کریں ہیں۔۔۔ ہاں بس پیسہ مل جاوے ہے اور یہاں آکر دھونس جماویں ہیں۔۔۔ مگر میرا بیٹا تو انجینیر ہے۔ وہ یہ سب ذلیل کام کیوں کرے گا۔۔۔ تم ہوتے سیاں تو دیکھتے کیسی بھائی بہن میں ٹھنی ہے۔ میں کبھی اسے سمجھاتی، کبھی اسے ٹھنڈا کرتی۔۔۔

وہ تو کہے ہے ہر سال ملنے آؤں گا، شاہینہ کے بیاہ کے لیے بہت سے روپے بھیجوں گا۔۔۔ اپنی ماں اور ابا میاں کا علاج کراؤں گا ولایت بلاکر، میں کوئی تنویر بھائی جان نہیں ہوں۔۔۔

ہائے اللہ خدا تو شیطان کی آنت ہو گیا۔۔۔ توبہ کیا کیا لکھ گئی۔

تم کب آؤ گے۔ بس اب غصہ تھوک دو۔۔۔ اختر بھائی کی بیماری

کا بہانا ہے یہ میں جانتی ہوں۔
اس خط کے ملتے ہی آجاؤ ۔۔۔ اور تمھیں میری سوگند ۔۔۔ غزالی کو اجازت دے دو ۔۔۔ پیسہ کا کیا ہے۔ کم میں گزارہ کرلیں گے ۔۔۔
تمہاری اپنی مہرو
ان کے آنسو بہہ بہہ کر کاپی کے صفحات پر پھیل رہے تھے ۔۔۔ مہرو ۔۔۔ مہرو ۔۔۔ کہاں ہے تمھارا اکلوتا سعادت مند غزالی ۔۔۔ کہاں ہے تمھاری چہیتی اور چاہنے والی بیٹی ۔۔۔ تمھاری سب تمنائیں خاک میں مل گئیں۔
انھوں نے کاپی بند کرنی چاہی تو آخر کے دو چار صفحے کھل گئے ۔۔۔ یہ کیا ۔۔۔ یہ خط تو نہیں ۔۔۔ کیا لکھا ہے مہرو نے؟ کیسے ٹیڑھے میڑھے لفظ ہیں ۔ شاید پچھلی بیماری کے بعد کا لکھا ہوا ہے۔ اے اللہ۔ میں کیا کروں ہائے شاہین ۔۔۔ بھی مجھے یوں بھول جائے گی ۔۔۔ میری بیماری کا سن کر بھی نہ آئے گی! شاہین! ۔۔۔ شاہین تو وہی ہے نا جو کہے تھی ۔۔۔ اماں دنیا تمھیں چھوڑ دے مگر میں امی ۔۔۔ ابو کو ۔۔۔ وہ لاڈ میں ابو امی کہا کرے تھی ۔۔۔ کبھی نہ چھوڑوں گی ۔۔۔ بس یہ نہیں کہتی اس نے بیاہ کیوں کیا ۔۔۔ کیوں نہ کرتی ۔۔۔ کہنے کو کچھ بھی کہا جا سکتا ہے مگر دل! اور جذبوں کو کون کچل سکے ہے ۔۔۔ یہ تو اللہ میاں تیرا حکم بھی ہے ۔۔۔ میں تو اسے الٹا سمجھاؤں تھی کہ بیٹی بیاہ کرنے سے کیا ماں باپ چھوٹ جاویں ہیں ۔۔۔ ہاں آدمی دیکھ کر کریں گے ۔۔۔ خورشید کے میاں جیسا نہ ہو جو آنے بھی نہ دے ۔۔۔ اور وہ ہزار باتیں خورشید ۔۔۔ اس کے میاں تنو اور غزالی کو سنا دے تھی کہ خود غرض ہیں، بے حس ہیں، بے محبت ہیں ۔۔۔ امی میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی ۔۔۔ یہ کیسے ہو سکے گا تم اور ابو بیمار ہو، بڈھے ہو اور میں بیاہ رچا لوں ۔۔۔ اور میرا دل ایک طرف تڑپتا کہ ہائے میری بچی کیسی مصیبت میں ہے۔ نوکری کرے،

خرچ اٹھا دے ـــ خدمت کرے ـــ اور ساتھ ہی دل کے اندر سے کوئی کہتا ایسی بیٹی ـــ ارے اس پر سات بیٹے قربان ہیں ـــ اس کے ابو کہتے ہیں نے سر پر چڑھا لیا ہے! وہ تو میرے ساتھ بحث کرے تھی ۔ جھگڑے تھی ـــ بیاہ شادی کی ـــ ' دوستوں کی باتیں کرے تھی ـــ وہ کیا جانیں ـــ میرا دل شاہین سے باتیں کر کے کتنا ہلکا ہو جاوے تھا ـــ میاں سے دل کی ہر بات تھوڑی کہی جاوے ہے ۔ پھر بات بھی کس کی ان بچوں کی جن کے نام سے وہ چڑنے لگے ہیں ـــ غزالی کی بے ہودگی اور تنو کے گھر جو حادثہ ہوا ـــ اس کے بعد وہ نہ ہوتی تو میرا کلیجہ پھٹ جاتا ـــ

مگر اب ـــ اب پیسہ کی چمک دمک نے ـــ میاں کی دولت نے ـــ عیش و آرام کی زندگی نے میری لاڈلی کو کیسا بدل دیا اللہ میاں ـــ یہ ـــ یہ وہی شاہین ہے؟ یقین نہیں آتا ـــ دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے ـــ یہ تو کبھی سوچا بھی نہ تھا ـــ ہائے میرا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے کہ کس سے دل کا درد کہوں ۔ پہلے تین کا دکھ تھا ـــ اب چوتھی کی بے وفائی ـــ بے محبتی نے تو اندر والے کو گھن لگا دیا! اس کے ابو بیمار پڑے ـــ مجھے موت نظر آ رہی تھی! اور وہ آئی تو ہوٹل میں رہی ـــ بیگموں کی شان سے کھڑی کھڑی آتی اور دیکھ کر چلی جاتی ـــ اور محبت اور ممتا کا بدلہ روپے سے کرنا چاہے تھی ـــ ہائے شاہین ـــ میرے لیے تو یہ بھی نہ کیا ـــ جس کی ماں فالج میں پڑی ہو ـــ اور بیٹی سن کر ٹال جائے ـــ نہ جنتی ایسی اولاد ـــ کاش بے اولاد رہی ہوتی تو صبر تو ہوتا ـــ دوسرے رحم کھا کر خدمت کر دیتے ـــ تم لوگوں کی یاد ہی میرا پیچھا چھوڑ دے ۔ کیوں دل کو صبر نہیں آتا ۔ کیوں نہیں سمجھ لیتی کہ میرا کوئی نہیں ـــ ہائے توبہ اللہ تو ان سب کو جہاں رکھے ـــ سلامت رکھے ـــ میں مر جاؤں' وہ زندہ رہیں ـــ اب مرنے میں رہ

بھی کیا گیا ہے۔ اب کی بار فالج کا حملہ ہوا تو میں نہیں بچوں گی ـــــ مگر سیّاں کا کیا ہو گا ـــــ کس کے پاس رہیں گے۔ کون خدمت کرے گا ـــــ ارے ....."

ان سے اب اور پڑھا نہ گیا ـــــ میز پر سر جھکا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے ـــــ ہائے مہرو کے دل میں اتنے گہرے زخم تھے، مگر وہ مجھ سے بھی چھپاتی رہی۔ یہ ظاہر کرتی رہی کہ اسے بچوں کی جدائی اور سنگ دلی کا کوئی دکھ نہیں ـــــ کتنا مشکل ہوتا ہے دل کے زخموں کو چھپانا ـــــ کتنا کٹھن ہے کہ کوئی دردمند نہ ہو اور انسان اندر ہی اندر گھٹتا رہے ـــــ گھلتا رہے۔

اس کی خدمت کسی نے نہ کی ـــــ جس نے سبھی کی خدمت کی۔ اپنی ماں کی، اپنے بھائی کی اور سب سے زیادہ میری ماں کی۔ ماں جی کا بڑھاپا تھا مزاج ہمیشہ کا چڑچڑا ـــــ بیماری کیسی سخت ـــــ سینے کا کینسر ـــــ لیکن مہرو نے دن کو دن نہ جانا، رات کو رات نہ سمجھا ـــــ ہر وقت ان کی خدمت ـــــ لگتا تھا یہ عورت نہیں لوہے کی بنی ہوئی مشین ہے۔ مشین بھی تھک جاتی ہے، بند ہو جاتی ہے مگر وہ چھ سات مہینے تک نہیں تھکی۔ کسی چیز سے گھن نہ کھاتی ـــــ گندے کام خود کرتی ـــــ کہ نوکر منھ بنائیں گے ـــــ کپڑے خود دھوتی ـــــ ان کو اٹھانا بٹھانا، ان کو کھلانا پلانا، کس کس چیز کو یاد کروں ـــــ ان کے حواس جواب دے رہے تھے ـــــ آٹھ دن اور آٹھ راتیں تو ـــــ سکرات کا عالم رہا ـــــ منھ سے بول نہ سکتیں ـــــ کھانا پینا تقریباً چھوٹ ہی گیا تھا ـــــ کیسے کیسے وہ چند چمچے عرق یا دودھ کے ان کے حلق سے اتارتی تھی۔ بدن دباتی تھی ـــــ نہلاتی تھی ـــــ دوائیں پلاتی تھی ـــــ اور خورشید کو جو سولہ سترہ برس کی تھی ہر وقت اپنے ساتھ لگائے رکھتی ـــــ بیٹی بزرگوں کی خدمت میں عظمت ہے خدا خوش ہوتا ہے ـــــ اس کا بڑا اصلہ ہے ـــــ مجھ سے جھگڑا کرتی، تم پاس نہیں آتے ـــــ کام نہیں کرتے ـــــ دیکھو ان کے منھ پر ہر

وقت تمھارا نام رہتا ہے سلّو ــــ سلّو پکارتی رہتی ہیں ــــ مجھ سے دیکھا نہ جاتا تھا مگر وہ پاس بٹھاتی تھی ــــ میں ہی گود میں اٹھا کر اندر باہر کرتا تھا ــــ ننو کو کس قدر چاہتی تھیں ــــ وہ بھی دادی سے ماں سے زیادہ محبت کرتا تھا ــــ مگر یہ مہرو کی تربیت ہی تو تھی جو پوتا پوتی دن رات ان کا کام کرتے تھے ــــ خدایا ــــ ہم نے اپنی ماں کی ایسی خدمت کی ــــ اور ہماری اولاد ــــ چار بیٹے بیٹیاں، دس نواسے پوتے ــــ دو بہوویں ــــ دو داماد ــــ کون نہیں ہے ــــ مگر مہرو کو کوئی پانی دینے والا نہ تھا ــــ میرے ہاتھ پاؤں جواب دے چکے ہیں ــــ بچاری رحیمن بوا نہ آتیں تو اتنا بھی کوئی کرنے والا نہ تھا ــــ ہاں مہرو تم بہت دکھی تھیں تمھارا دل زخمی تھا ــــ مگر مومن کا دل تھا ــــ جاتے جاتے سب کو معاف کر گئیں!

ان کو یاد آیا کہ اس دن مہرو کو ایک دم ہوش آگیا تھا ــــ آواز جو منھ سے نہیں نکل رہی تھی، صاف ہو گئی ــــ بیہوشی میں وہ ننو منّو ــــ شاہین ــــ خورشید سب کو پکارتی رہی تھیں ــــ مگر ہوش آیا تو بس میرا نام لیا۔

"ان کو بلا دو بوا ــــ" میں نے کہا ــــ مہرو ــــ میں تو تمھارے پاس بیٹھا ہوں۔" گردن آہستہ سے گھمائی "سیاں" آج بھی لہجے میں وہی شہد تھا ــــ پچاس برس پہلے والا میٹھا لہجہ تھا ــــ ہاتھ آہستہ سے اٹھایا ــــ مگر وہ گر گیا ــــ کمزوری کا یہ عالم تھا کہ آنکھ کھولنا ہاتھ ہلانا دشوار تھا ــــ انھوں نے ہاتھ تھام لیا

سیاّں ــــ کوئی نہیں آیا ــــ" وہ چپ رہے ــــ کیا جواب دیتے ــــ

"تار کا جواب کسی نے نہیں دیا؟" آہستہ سے اس نے پوچھا تھا

"آج کل ڈاک میں گڑبڑ ہے ــــ ہر جگہ ہڑتال ہے ــــ"

"سب تو حیدر آباد میں ہے —— وہ بھی ——"

"وہ آنے والا ہے"

"اور شاہین —— میری بٹیا ——" ہائے ان کی محبت۔

"مہرو۔ تم تو جانتی ہو پاکستان سے آنے جانے میں کتنی مشکلات ہیں۔"

"کیا میں انہیں ... نہ دیکھوں گی ——"

"نہیں مہرو —— ایسی بات نہ کہو —— دو چار دن میں سب آجائیں گے
" وہ جھوٹ پر جھوٹ بول رہے تھے۔ وہ ہنسیں —— کھوکھلی بے رنگ ہنسی!

" دو —— چار —— دن —— سیّاں —— اب اتنی فرصت کہاں ہے
... " وہ چپ رہے آواز بھرا رہی تھی اور وہ اس پر قابو پانے کی ناکام کوشش
کر رہے تھے ——

"خورشید —— عالیہ —— وہ —— تو —— دو قدم ——"

"خورشید کے بچے کچھ بیمار ہیں —— اور عالیہ۔ ارے ہاں —— اس کا
لڑکا ولایت سے آیا ہوا ہے ——" حالاں کہ دونوں باتیں ایسی نہ تھیں کہ وہ
لوگ نہ آسکتیں۔ وہ غمناک انداز میں مسکرائیں "خوش —— نصیب ہے ——
ان ——"

"اے بیوی —— جب اپنی ہی اولاد —— ایسی بے محبت، نافرمان نکل
جاوے تو دوسروں کا کیا گلہ ——" رحیمن بوا —— اونچ نیچ کیا جانیں —— وہ دل
کھول کر ان کے بچوں کو برا بھلا کہہ رہی تھیں اور مہرو کی آنکھوں سے آنسو بہہ
رہے تھے۔ کیسی ہوشیار تھیں اس دن —— دواؤں کا بھی اثر نہ ہو رہا تھا
کہ غفلت ہی آجاتی —— پھر باتیں کرتے کرتے وہ ذرا غافل ہو گئیں —— وہ
خود خیالات میں کھوئے بیٹھے رہے۔ رحیمن نے کہا بھی میاں تم بھی ذرا کمر لگا لو۔
بیوی تو سو گئیں —— مگر ان کا دل نہیں مانا —— اور پھر اچانک ان کے کان
میں آواز آئی "میاں چائے ——" وہ چونک پڑے۔ چائے وہ ہمیشہ خود

لاکر انھیں پلایا کرتی تھی ــــ کبھی کہتی "میاں چائے"ــــ اور کبھی "میاں چائے لوــــ" بھی کہہ دیا کرتی تھی ــــ مگر یہ تو نظیرا تھا اور سردیوں کی شام کا اندھیرا کچھ پہلے ہی کمرے میں گھس آیا تھا ــــ انھوں نے ایک گھونٹ میں ٹھنڈی میٹھی بدمزہ چائے حلق میں انڈیل لی ۔ مہرو کی سی چائے کون بنا سکتا ہے ۔

"میاں ــــ بیوی ــــ پکار رہی ہیں ۔" رحیمن نے ان کو متوجہ کیا ۔ وہ جلدی سے اٹھ کر قریب آکر پٹی پر بیٹھ گئے ، بیوی کا ہاتھ پکڑا تو ٹھنڈا برف ــــ نبض دیکھی تو اس قدر کمزور ــــ مگر کل ہی تو نازش ڈاکٹر کو لایا تھا اور اس نے کہا تھا حالت خطرناک نہیں ہے ۔ مہرو کے چہرے پر ایک حسرت ناک تبسم ابھرا اور اپنا ہاتھ پلنگ کو ٹٹول کر میاں کے ہاتھ پہ رکھ دیا تھا ۔

"بہت پریشان ہو ؟" آواز خاصی سمجھ میں آرہی تھی ۔

"نہیں تو ــــ" وہ کچھ اور نہ کہہ سکے ۔

"ہاں ــــ پریشان نہ ہو ــــ وقت ... آگیا ــــ مگر ... جو ... اللہ کی مرضی ... وہ تڑپ گئے " یہ نہ کہو مہرو آج تو تم سب دن سے اچھی ہو ۔"

"میاں ... میری بات ــــ سنو ــــ"

"کہو میری مہرو ــــ جو جی چاہے کہو ــــ دل پر بوجھ نہ رکھو" انھیں اس کے لکھے وہ صفحات یاد آرہے تھے ــــ

"مجھے اپنا دکھ نہیں ــــ تم جانتے ہو ــــ میری سب سے بڑی تمنا یہی تھی ــــ یہی ــــ تھی نا ــــ ہے نا ــــ"

"ہاں" گھٹی ہوئی آواز ان کے منہ سے نکلی ــــ

"مگر ــــ تم ــــ تم ــــ اکیلے ــــ" اور آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہنے لگے ۔

"نہیں نہیں ــــ مہرو تم اچھی ہو رہی ہو ــــ ہم تم ہمیشہ ساتھ رہیں گے جب تک دم میں دم ہے ــــ"

"ہاں ـــ جب تک دم ـــ ہیں ـــ دم ہے ـــ مگر ـــ خدا کا حکم ... دیکھنا تم ـ تم ـــ کہیں نہ جانا ـــ کسی کے پاس نہ جا کر رہنا ـ رحیمن بوا ـــ نظیرا بابا ـــ یہ سب تمھارے پاس رہیں گے ـــ پھر ـــ اختر بھائی ـــ" وہ ہانپ گئیں۔ رحیمن نے لپک کر چند چمچے پانی کے منھ میں ڈال دیے" اے بیوی میں صدقے ـــ تھک گئی ہو ـــ جی برا نہ کرو ـــ اللہ رحم کرے گا ـــ!! مگر ان کی آواز میں وہ یقین ـــ وہ سکون نہ تھا جو مریض کو ڈھارس دیتا ہے کہ وہ اچھا ہو رہا ہے ـــ

انھوں نے بیوی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا ـ اف کس قدر سرد ہیں یہ ہاتھ ـــ

"اور تم ـــ تم انھیں معاف کر دینا ـــ آخر ـــ ہمارے بچے ہیں.... میں نے بھی معاف کیا ـــ تم گواہ رہنا ـــ زمانے کا رنگ ہی یہی ہے ـــ" وہ جانتے تھے کہ وہ نام اس لیے نہیں لے رہی ہے کہ پھوٹ بہے گی ـــ مگر اپنے بچوں کو وہ کتنا چاہتی تھی ـــ چاہتی ہے ـــ

"ذرا آرام کر لو ـــ بیوی!" انھوں نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں اب تو آرام ہی آرام ہے ـــ تم ـــ تم مجھے ـــ یاد رکھو گے نا ـــ" ان کے دل کے اندر سے ایک چیخ سی ابھری تجھے کیسے بھول سکتا ہوں مہرو ـــ" مگر ہونٹ صرف ہل کر رہ گئے!

"کبھی کبھی آجایا کرنا ـــ" اب سانس زور زور سے آ رہی تھی ـــ" نہیں ـــ نہیں ـــ مت آنا ـــ روؤ گے ـــ اللہ ـــ اللہ ـــ میرے بچے ـــ" انھوں نے دیکھا سانس اکھڑ رہی ہے۔

"بیا للہ ـــ میرے قصور ـــ کہا سنا ـــ"

"میری جان ـــ میری مہرو ـــ تم جنت کی حور ہو ـــ مومنہ ہو ـــ قصوروار تو میں ہوں ـــ"

مسکراہٹ اس کے بے رنگ مرجھائے بوڑھے ہونٹوں پر ابھری ـــــ پاکیزہ مسکراہٹ۔ مقدس مسکراہٹ!

وہ جانے کب تک اس کا ہاتھ تھامے بیٹھے رہے ـــــ سانس کی آمد و شد سخت تکلیف دہ ہو چکی تھی ـــــ ڈاکٹر نے یہی تو کہا تھا ـــــ سانس پھولنا ٹھیک نہ ہوگا۔ اگر کسی طرح آکسیجن ـــــ

مگر وہ آکسیجن کہاں سے لاتے اس چھوٹے سے قصبے میں۔ شہر کیسے لے جاتے ـــــ ہلانا بھی دشوار تھا ـــــ بس رحیمن بوا پاس بیٹھ کر کسی شیشی میں سے چمچہ چمچہ پانی ٹپکاتی رہیں ـــــ اور منہ میں کچھ پڑھتی رہیں....

اف کیسا کرب ـــــ کیسی تکلیف تھی ـــــ سینہ اٹھتا اور بیٹھتا صاف محسوس ہوتا تھا ـــــ سوجے پاؤں ـــــ ٹھنڈے تھے ـــــ ہاتھوں میں جیسے دم ہی نہ رہا تھا ـــــ آنکھیں بار بار کھولتیں، ان کو دیکھتیں اور پھر بند کر لیتیں!

ـــــ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا ـــــ اچانک پھر آنکھیں کھولیں ـــــ لب ہلے ـــــ "اب ـــــ اب وقت آگیا ـــــ اب آجاؤ ـــــ سیّاں!"

"میں تمہارے پاس بیٹھا ہوں ـــــ"

"وہ آگئے ـــــ وہ آگئے ہیں ـــــ پڑھو ـــــ پڑھو ـــــ"

رحیمن نے لپک کر قرآن پاک ان کی گود میں دے دیا ـــــ بلک کر بولیں سیاں۔ یٰسین پڑھیے ـــــ"

ان کا دماغ سن تھا۔ دل بے حس تھا ـــــ پڑھنا چاہتے تھے ـــــ مگر پڑھ نہ سکتے تھے ـــــ کچھ یاد نہ آرہا تھا ـــــ

"ارے میاں ـــــ بیوی تو سدھاریں ـــــ" رحیمن ان کی آنکھیں بند کر رہی تھی

اور چہرہ ـــــ اور چہرہ ـــــ اف ـــــ اف ـــــ خدایا ـــــ

(۱۴)

ان کو دیکھ کر سلیم بیگم لڑکھڑاتی لنگڑاتی آگے بڑھیں۔۔۔ ان کا بھاری جسم سفید ساڑھی میں لپٹا ہوا تھا۔۔۔ سر کا آنچل ماتھے تک جھکا تھا۔ وہ اختر علی سے سال بھر بڑے تھے اور سلیمہ بیگم انھیں جیٹھ مانتی تھیں۔ ان کے پاس سیاہ دوپٹہ اوڑھے ثریا کھڑی تھی۔۔۔ منھ سرخ، آنکھیں سوجی مگر بالکل خاموش!

"بھائی صاحب۔۔۔ اب۔۔۔ اب اجازت دیجیے۔۔۔!"

۔۔۔"اجازت؟ کس بات کی اجازت مانگ رہی ہیں سلیمہ بھابی؟ انھوں نے سوچا۔۔۔"

"چچا جان۔۔۔!" ایک سسکی کے ساتھ ثریا کے منھ سے نکلا اور انھوں نے اپنا کانپتا ہاتھ اس کے سر پہ رکھ دیا۔۔۔ ثریا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔۔۔

"ہائے انکل۔۔۔ ماسی جی۔۔۔" سروج نے آگے بڑھ کر ان کے سینے پہ سر رکھ دیا اور رونے لگی!

"بیٹی ــــ بیٹی سروج ــــ ثریا بی بی ــــ صبر کرو ــــ تم ہی لوگ ہو ان کے اور کوئی نہیں ــــ" کتنا دکھ تھا ان کی آواز میں عالیہ جو آنکھوں پہ پلو رکھے تھی ایک دم جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔ تیوری پر کئی بل ابھر آئے۔

"بھائی صاحب ــــ میں خود بھابی کی آخری خدمت کروں گی ــــ رحیمن، ثریا، عالیہ اور پڑوس کی کئی عورتیں موجود تھیں ــــ آپ اطمینان رکھیں ــــ"

سلیمہ کی آواز کانپ رہی تھی۔ ویسے بڑا ضبط اور وقار تھا ان میں۔ سہیل میاں کو یاد آیا اختر علی کہا کرتے تھے یار سہیل تم بڑے خوش نصیب ہو ــــ بڑی چاہنے والی بیوی ملی ہے۔ یہاں تو ایسی میٹر آف فیکٹ قسم کی عورت سے سابقہ پڑا ہے کہ بس ــــ وہ اونچا قہقہہ لگاتے ــــ حالاں کہ سہیل میاں جانتے تھے کہ وہ اپنی اس میٹر آف فیکٹس بیوی سے کس قدر محبت کرتے ہیں ــــ کتنے خوش ہیں۔

"تو پھر بھائی صاحب اجازت دیجیے ــــ"

"اجازت کا مطلب اب سمجھ میں آیا کھوکھلی سی آواز نکلی "جی ہاں ــــ" مگر کتنی مختلف تھی یہ آواز ان کی اپنی آواز سے ــــ

وہ لنگڑاتی ہوئی کمرے کے اندر چلی گئیں، ثریا، رحیمن، سروج، عالیہ اور کئی اور عورتیں ان کے ساتھ اندر گھس گئیں ــــ اندر باتوں کی، کلمہ پڑھنے کی ــــ آوازیں آرہی تھیں ــــ شاید وہ لوگ چھپر کٹ سے اسے چھوٹی چارپائی پر منتقل کر رہے ہیں . . .

ان سے کھڑا نہ رہا جا سکا ــــ برآمدے پہ بچھے چوکے پر ذرا سا ٹک گئے۔ اف کتنی حساس تھیں وہ ــــ ملازمہ سے پیٹھ تک نہ ملواتی تھیں ــــ غسل خانے سے کبھی خالی تولیہ لپیٹ کر باہر نہ نکلتی تھی ــــ مزاج میں کتنی حیا تھی ــــ پردے کا کتنا خیال تھا ــــ جب زمانہ بدلا ــــ ملک تقسیم ہوا ــــ لڑکوں کے اصرار پہ دوسرے ملکوں تک جانا پڑا تو اس نے پردہ چھوڑ دیا

تھا۔ مگر پوری آستین کے بلاؤس پہنتی، سر ڈھک کر باہر نکلتی ۔ اسے اپنی بھوؤں اور دوسری لڑکیوں کے ادھورے لباس پر بہت غصہ آتا اور بعض وقت بے دھڑک اعتراض بھی کر دیتی ... مگر ۔ مگر کون سنتا ہے اس زمانے میں کسی بزرگ کی نصیحت ۔ اور آج ۔ آج وہ ۔ دوسروں کے ہاتھوں میں ہے معذور، مجبور ۔ بے بس ۔ انھیں یہ بھی خبر نہ تھی کہ شرع کا کیا حکم ہے ۔ اس معاملہ میں بھی کتنی احتیاط اور پردے کا کتنا خیال رکھا گیا ہے!

انھوں نے منھ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا ۔ مگر کلمہ پڑھنے کی آوازیں آ رہی تھیں ۔ پھر سلیمہ بھابی کی آواز آئی ۔ عالیہ بیٹی ۔ آ تو بھی آ جا ۔ کوئی تو ان کا اپنا بھی ہو ۔ عالیہ کے منھ سے ایک چیخ نکلی ۔ نہیں نہیں میں ۔ میں اپنی پھوپی اماں کو ۔ خالہ ۔ میں یہ سب نہیں دیکھ سکتی ۔ میرے دل میں برداشت نہیں ۔ میں پھوپا ابا کے پاس ہوں ۔" سلیمہ بھابی کی غصّے بھری آواز ان کے کان میں پڑی ۔" واہ رے تیرا دل" اور کلمہ کی گنگناہٹ دور ہوتی گئی ۔ اس طرف کی صحنچی میں ۔ (جواب تک کمرے میں نہ بدلی گئی تھی) ان کا پلنگ لے جایا گیا اور پردہ برابر کر دیا گیا۔ باہر کئی کورے گھڑے رکھے تھے ۔ بیری کے پتّے تخت پر دھرے تھے' اگر اور کافور کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی ۔ اور ایک طرف ایک دری پر کچھ لوگ کپڑا پھیلائے کچھ سی رہے تھے ۔ ایک مولوی صاحب کچھ لکھ رہے تھے ۔ اور دور صحن میں سروج اور اس کی ماں اور پڑوس کی کئی غریب عورتیں بیٹھی تھیں .... شاید وہ جن کی وہ چپکے چپکے کچھ مدد کر دیا کرتی تھی۔

دروازے سے کوئی لڑکھڑاتا ہوا داخل ہوا' چاروں طرف دیکھا ۔ عالیہ کھڑی ہو گئی ۔" خورشید باجی ۔ آ گئیں ۔" ان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا مگر وہ اندھا دھند بھاگتی ہوئی ماں کے پاس صحنچی میں گھس گئی اور ایک چیخ کے ساتھ یہ جملہ کان میں پڑا ۔ اماں جی

ہیں۔ آ گئی ــــ میں خود اپنی اماں کو نہلاؤں گی بچی ــــ یہ ان کا حکم تھا۔ وصیت تھی ــــ" وہ اور نہ سن سکے۔ بے قرار ہو کر ان کے کمرے میں گھس گئے جہاں چھپر کھٹ اب خالی پڑا تھا۔ ہاں سرہانے پرانی میز پر بہت سی دواؤں کی شیشیاں، گلاس، چمچہ فیڈنگ کپ اب بھی چنے ہوئے تھے۔ نیچے مراد آبادی چلمچی اور بڑا سا تانبے کا اگالدان تھا ــــ ان کی کرسی کونے میں کھسکا دی گئی تھی ــــ اور عالیہ پلنگ کی پٹی پر اپنا سر جھکائے بیٹھی تھی ــــ وہ جا کر کونے میں پڑی آرام کرسی پر گر گئے!

عالیہ نے سر اٹھایا، پھوپا کو دیکھا ــــ خالی پلنگ پر نظر ڈالی اور پھر اسی طرح بیٹھ گئی! دل کی کھٹ۔ کھٹ کے ساتھ خیالات لفظ بن کر کانوں میں چوٹیں لگا رہے تھے ــــ

"پھوپی اماں ــــ پھوپی اماں ــــ آپ نے مجھے الگ نہ کیا ہوتا دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر نہ پھینک دیا ہوتا تو آج یوں کس مپرسی میں دم نہ توڑتیں ــــ کہاں ہیں وہ آپ کے لاڈلے بیٹے اور چہیتی بہو ــــ جن کی خاطر آپ نے مجھے نہیں اپنایا۔ میری دس برس کی امیدوں، آرزوؤں پر پانی پھیر دیا ــــ میری خدمت اور محبت کا خیال نہیں کیا ــــ اپنی بھاوج کو دیے قول کو بھول گئیں۔ آج میں آپ کی بہو ہوتی تو آپ کی خدمت کرتی ــــ آپ کے پاس رہتی ــــ پھوپا ابا کو یوں بڑھاپے میں اکیلے یہ صدمہ نہ جھیلنا پڑتا ــــ"

پھر اچانک اس نے مڑ کر سہیل میاں کو دیکھا، پھوپا ابا آپ کا بیٹا اور بہو ــــ نہیں آئے اپنی ماں کو دیکھنے ــــ؟"

یہ طنزیہ جملہ اور انداز سیدھے ان کے دل میں چبھ گیا۔

"آپ کا بیٹا بہو" اور "اپنی ماں" عالیہ کے دل میں آج بھی داغ ہے کدورت ہے۔ وہ اس صدمے کو اب تک نہیں بھولی ــــ کیسے بھولتی

غصّہ، افسوس اور رحم کے جذبے میں بدل گیا۔۔۔۔ٹھیک ہی تو ہے تلخی اس کے دل میں۔۔۔۔ وہ سوچ رہے تھے۔

اور عالیہ کو وہ دن یاد آیا جب پھوپا ابا اور پھوپی اماں نے اس کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تھا۔۔۔۔ امیدوں کی جڑیں اکھاڑ پھینکی تھیں

پھوپا ابا اخبار پڑھ رہے تھے اور پھوپی اماں پریشان ان کا منھ دیکھ رہی تھیں۔۔۔۔ وہ برابر کے کمرے میں میٹرک کے امتحان کی تیاری میں لگی ہوئی تھی مگر چک پڑی کھڑکی سے صورتیں بھی نظر آ رہی تھیں اور آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔۔۔ آج صبح تنویر کا خط آیا تھا اور وہ الجھن میں تھی کہ آخر اس نے کیا لکھا ہے جو پھوپی اماں اتنی پریشان ہیں۔

"سیاں ..." پھوپی اماں نے بھی خوب رومانٹک لفظ چھانٹا تھا میاں کے لیے اور بے تکلّف سب کے سامنے اسی نام سے پکارتی تھیں۔۔۔۔ شاید وہ بھول ہی گئی تھیں کہ یہ لفظ۔۔۔ اس عمر میں۔۔۔ ان کے منھ سے بڑا عجیب لگتا ہے۔۔۔ جیسے آج کل کے لوگ بلا تکلف ایک دوسرے کو ڈارلنگ کہتے ہیں!

"سیّاں۔۔۔ بس بند کرو یہ اخبار۔۔۔۔" انھوں نے نظر اٹھا کر بیوی کو دیکھا اور پھر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ آج کل سیاسی اتھل پتھل ہو رہی تھی اور وہ اخبار پابندی سے پڑھتے اور ریڈیو سنتے تھے۔

"کیا ہے کیا؟"

"تم سنتے تو ہو نہیں۔۔۔"

"یہ ضروری ہے کہ اسی وقت سب کچھ سناؤ۔۔۔۔ دیکھ رہی ہو اخبار پڑھ رہا ہوں"

"کچھ بسنت کی بھی خبر ہے؟ ہر وقت اخبار۔۔۔۔ اخبار۔۔۔"

"تم میرے اخبار سے کیوں جلتی ہو آخر؟"

"ارے گھر کی خبریں سنو کیا ہو رہا ہے" پھوپا ابا نے اخبار پٹخ دیا۔

"اب دل بھر کر گھر کی محلے پڑوس کی ـــــ سب خبریں سنا ڈالو

آخر کیا قیامت ٹوٹی ہے؟" وہ جھنجھلا رہے تھے۔

"قیامت ہی ٹوٹی ہے" گمبھیر آواز میں انھوں نے جواب دیا۔

اور پھر پھوپی اماں نے انھیں جو بتایا اس نے خود اس کو سکتے کے

عالم میں کر دیا ـــــ اور پھوپا ابا سن سے بیٹھے رہ گئے ـــــ تنویر

نے کسی بمبئی کی لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا ـــــ اس کی صورت

پریوں کی سی ہے۔ خاندان بہت امیر، بہت اعلیٰ ہے ـــــ ایم۔ اے

پاس ہے اور جانے کیا کیا بکواس تھی!

"اب کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں۔ وہی ہوگا جس کا فیصلہ ہم دس برس پہلے کر چکے ہیں"۔

پھوپا ابا غصے میں چلائے۔

"ارے آہستہ بولو ـــــ عالیہ نہ سن لے ـــــ"

"تم اس سے کب تک چھپا سکو گی ـــــ"

"یہی تو پوچھتی ہوں کہ کیا کریں ـــــ فیصلہ ہمارا تھا ـــــ تنو کا نہیں"۔

"مگر تنو بر جانتا تھا ـــــ اس نے مخالفت کبھی نہیں کی تھی ـــــ

اب اسے انکار کا کیا حق ہے ـــــ"

"ہر مرد کو انکار کرنے کا حق ہوتا ہے۔ تم نے بھی اپنی ماں سے انکار

کیا تھا"۔

"ہاں۔ مگر ان کے فیصلے کے سامنے سر بھی تو جھکا دیا تھا ـــــ"

"اور ان کا اور میرا دل بھی دکھایا تھا ـــــ"

"بیکار کی باتیں نہ کرو ـــــ تمھیں اپنے بیٹے سے بات صاف کرنی چاہیے

تھی ـــــ"

"میں کیا بات صاف کرتی ۔۔۔ سب جانیں تھے کہ عالیہ اس سے منسوب ہے ۔۔۔ ہائے اب میں عالیہ کو کیا منھ دکھاؤں گی ۔۔۔ بے ماں باپ کی بچی ہے ۔۔۔ بھابی نے یہ کہہ کر مجھے سونپا تھا ۔۔۔ مررخ اب عالیہ تمھاری ہے ۔۔۔ بارہ برس میں نے اسے کلیجے سے لگا کے رکھا۔ ہم سب اسے تنو کی دلھن سمجھتے رہے"

"بس تم اسے یہی لکھ دو کہ اتنا پرانا فیصلہ بدلا نہیں جا سکتا"

"تم لکھو نا ۔۔۔ تم باپ ہو ۔۔۔ تمھارا ڈر ہو گا اسے"

"لاڈ پیار میں تم نے بگاڑا ہے ۔۔۔"

"میں نے بگاڑا یا تمھاری ماں نے ۔۔۔ ضدی اور خودسر بنا دیا پوتے کو"

"میری ماں تو کب کی مر چکیں ۔۔۔ تم ہی اس کی ضدیں پوری کرتیں اور لاڈ چونچلے کیا کرتی تھیں ۔۔۔"

"ہائے تو میں اپنے بچے سے محبت بھی نہ کرتی۔ ایک کو کھو چکی تھی۔ دوسرا میری آنکھوں کا نور تھا ۔۔۔ خورشید تمھاری لاڈلی تھی ۔۔۔ میری جان تو وہی تھا ۔۔۔ ہاں ہاں میں اس کی دموں دیوانی تھی ۔۔۔ ہر ماں ہوتی ہے اس کا کیا طعنہ دو ہو ۔۔۔"

"ہاں تمھیں اپنے لاڈلے کا خیال ہے اور اس معصوم لڑکی کا نہیں۔ جس کے دل میں دس برس سے تم نے اس کا خیال بٹھا رکھا ہے؟" وہ اس کی وکالت کر رہے تھے ۔۔۔

"خیال کیوں نہیں ۔۔۔ وہ تو میرا خون ہے ۔۔۔ میرے مرے بھائی کی نشانی ہے ۔۔۔ مگر کروں کیا ۔۔۔ تنو جیسا ضدی ہے تم بھی جانتے ہو ۔۔۔ عالیہ اسے ۔۔۔ بیوی کے روپ میں پسند نہیں ۔۔۔" اور اس کے دل کے اندر سے کوئی چیز تڑاخ سے دو ٹکڑے ہو گئی تھی ۔۔۔

"تم اسے لکھو کہ ماں باپ کی پسند بہترین پسند ہوتی ہے۔ دیکھو تمہارے باپ نے بھی تو اپنی ماں کی پسند سے بیاہ کیا اور آج تک نہیں پچھتایا۔"

"ہاں شادی ماں کی پسند سے کی ـــــ اور عشق اپنی پسند سے"

"مہرو ـــــ" وہ چلائے۔

"ہاں ہاں سچی بات بری لگے ہے ـــــ عشق تو تمہارے گھرانے کی گھٹی میں پڑا ہے۔ اب پھوپا میاں کو کیا کہوں۔ میرے بزرگ تھے ـــــ پھر تمہارے بڑے بھیا ـــــ ساری عمر بچاری بھابی قسمت کو روتی رہیں ـــــ"

"تو میں بڑے بھیا جیسا ہوں؟"

"نہیں ـــــ وہ جو کرتے تھے ـــــ کھلم کھلا اور تم نے ـــــ چھپ چھپ ـــــ"

"بس خاموش رہو ـــــ"

"میں کیوں رہوں خاموش ـــــ کون جانے اب بھی تم اس بڈھے کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ملتے ہو گے ـــــ" پھوپی اماں کا لہجہ کتنا زہریلا تھا۔

بچارے پھوپا ابا۔ کتنے برس گزر چکے انھوں نے کبھی نسیم خالہ کو دیکھا بھی نہیں ـــــ نام بھی نہیں لیا ـــــ وہ خود ان سے سخت پردہ کرتی ہیں پچیس برس سے پھوپی اماں ان کی ذات کا ایسا جزو بن چکی تھیں جس سے جدائی یا بے وفائی کا وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ مگر پھوپی اماں کی تو فطرت ہی میں بدگمانی ہے شاید! ان کی وفا، محبت، پیار اور قربانی کا یہ صلہ دے رہی ہیں ـــــ آج تک ذرا سی بات دل میں لیے بیٹھی ہیں ـــــ پھوپا ابا غصے میں بھن بھناتے گھر سے نکل گئے اور ایک ہفتے تک واپس نہیں آئے وہ خورشید آپا کے پاس چلے گئے تھے جن کی اسی سال شادی ہوئی تھی! عالیہ سوچتے سوچتے اونگھ گئی تھی۔

چونک کر سہیل میاں نے چاروں طرف دیکھا ــــ پلنگ خالی تھا اور عالیہ فرش پر لڑھک سی گئی تھی ــــ سوگئی بچاری ــــ ساری رات کی جاگی ہے نا ــــ

عالیہ اب تک اس واقعہ کو نہیں بھولی۔ عورت کبھی نہیں بھولتی۔ ایک بار جس کو دل میں بسا لے اس کو نکال نہیں سکتی ہے ــــ مگر یہ آج کل کی ماڈرن عورت ــــ یہ تو روز نیا عشق کر سکتی ہیں ــــ ایک شوہر چھوڑ کر پھر دوسرا اور پھر تیسرا دل میں بسا لیتی ہیں مگر عالیہ ان جیسی کہاں ہیں ــــ اس نے کچھ بھی نہ کہا۔ پھوپی کے حکم پر سر جھکا دیا ــــ اس کے رشتے کے ماموں کے بیٹے سے ہم نے منگنی کر دی ــــ بیاہ بھی اپنی حیثیت سے بڑھ کر دھوم دھام سے کیا ــــ مہرو کا دل خون ہو رہا تھا مگر وہ بظاہر خوش و خرم شادی کا انتظام کر رہی تھی ــــ مہرو نے اپنا سب سے خوبصورت زیور۔ ہاتھوں کی نوگریاں جو اماں نے اسے چڑھاوے میں چڑھائی تھیں ــــ عالیہ کے ہاتھوں میں پہنا دی تھیں ــــ کہا کرتی تھی نا کہ یہ میری اللہ کے ہاتھوں میں زیب دیں گی ــــ عالیہ رخصت ہوئی تو کچھ زیادہ ہی رو رہی تھی اور جب میرے کہنے سے تنویر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا "جاؤ بہن خوش رہو ہمیشہ" تو وہ پھوپی کی باہوں میں بے ہوش ہوگئی تھی ــــ

مگر پھر عالیہ نے ہمارے گھر کو اپنا گھر نہ سمجھا ــــ مہرو دس بار بلاتی تو وہ ایک بار آتی ــــ وہ بڑی بے پروائی سے کہتی "ان سے اجازت بس دو دن کی ملی ہے ــــ بچے گھر پہ چھوڑ آئی ہوں ــــ" تنویر کی شادی میں بھی وہ نہیں آئی ــــ اس کی ساس کا خط آیا تھا کہ بہو کا پیر بھاری ہے۔ کیسے بھیجوں اور جب وہ آئی تنویر کی دلھن کو دیکھا تو وہی نوگریاں اس کو پہنا دیں جو مہرو نے اسے دی تھیں ــــ اور میری طرف دیکھ کر بولی تھیں "بھائی سچ مچ چاند کا ٹکڑا ہیں ــــ پھوپی اماں جیسی ساس کے لیے ایسی ہی بہو چاہیے تھی"

اس کا رنگ گندمی ہے ــــ مگر ناک نقشہ کتنا خوب صورت ہے ــــ اب تک کیسی پیاری لگتی ہے ــــ اور تنویر کی بیوی کتنی روڑھی ہو گئی ہے ــ"

اس سخت وقت میں انھیں ماضی کی کہانیاں کیوں یاد آ رہی ہیں۔؟ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا ــــ بھرا گھر ویران لگ رہا ہے ــــ اور خیالات کا ایک لامتناہی سلسلہ ان کو جکڑے ہوئے ہے۔

کتنے دھوم سے مہرو نے بیٹے کی شادی رچائی۔ کیسے چاؤ سے بڑے گھر کی پڑھی لکھی، خوب صورت بہو بیاہ کر لائی۔ مگر اسے کبھی ہمارا گھر، ہم لوگ خاص کر مہرو پسند نہیں آئی ــــ شروع میں شرما شرمی دو چار ہفتے کو آجایا کرتی تھی ــــ اسی نے تو اصرار کر کے باپ کے بزنس میں میاں کو شریک کیا تھا ــــ پھر ضد کر کے اسے امریکہ لے گئی ــــ اور پھر ــــ اور پھر۔ اف انھوں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

اگر عالیہ ہماری بہو ہوتی تو کیا وہ بھی یہی سلوک کرتی ؟ یوں پردیس میں لے جاتی ــــ پھر ملنے نہ دیتی ــــ مہرو تم نے عالیہ کا دل توڑا تھا ــــ قدرت نے تمھارا دل توڑا تمھارے بیٹوں کو تم سے چھین لیا۔

مگر وہ یہ سب کیا سوچ رہے ہیں ــــ مہرو کا کیا قصور تھا؟ وہ زبردستی کیسے تنویر کو مجبور کر سکتی تھی ــــ آج کے زمانے میں لڑکیاں نہیں مانتیں ــــ خود ہماری شاہین نے ــــ تو وہ بھی کیا کرتی ؟ ہم خالی ہاتھ ہو چکے تھے ــــ بھائیوں نے روپیہ کیا محبت پیار سے بھی ہاتھ اٹھا لیا تھا ــــ وہ کب تک ۔ ہم بڈھوں کے لیے اپنی زندگی خراب کرتی ــــ کرلی اس نے بھی اپنی پسند کی شادی۔ نازش کو ٹھکرا دیا۔

"ہائے مہرو ــــ کہاں ہیں آج تمھارے وہ کماؤ بیٹے، وہ لاڈلی بیٹی ہونہار اولاد ــــ مہرو ــــ مہرو ــــ"

عالیہ ان کا بازو ہلا رہی تھی ــــ" پھوپا ابا ــــ پھوپا ابا ــــ

آپ خواب دیکھ رہے ہیں — پھوپی اماں — کو پکار رہے ہیں اور وہ رونے لگی۔

انھوں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ سورج پر بادل آگیا تھا۔ دھند سی چھائی تھی مگر گھنٹہ ابھی تک دو ہی بجا رہا تھا۔

عورتیں نہلا دھلا کر، مہرو کو تیار کر کے، گہوارے میں لٹا کر ادھر آ رہی تھیں۔ کافور اور لوبان کی تیز خوشبو گھر بھر میں بسی ہوئی تھی۔ کلمہ پڑھنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ خورشید گہوارے کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ سوجی آنکھیں ماں کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ اماں — اماں جی کتنا پرسکون کتنا حسین، کتنا شانت ہے اس وقت آپ کا چہرہ لگ رہا ہے جیسے سارے دکھ سارے غم دور ہو گئے ہوں — یہ تقدس، یہ پاکیزگی آپ جیسی نیک عورت کے چہرے پر ہی نظر آ سکتی ہے۔ ایسا خوب صورت تھا بڑھاپا آپ کا جس پر جوان رشک کریں — ایسی مقدس ہے آپ کی موت کہ جس کی زندے آرزو کریں — چہرے کے گرد سفید بالوں کا یہ ہالہ — یہ بڑی بڑی ادھ کھلی آنکھیں جو پتھرائی نہیں لگتیں بلکہ معلوم ہوتا ہے سو رہی ہیں — ہمیشہ سوتے ہوئے آپ کی آنکھیں آدھی کھلی رہتیں تھیں نا — اس لیے کہ آپ کی پتلیاں ابھری ہوئی تھیں — اماں — یہ حسن — یہ پاکیزگی انسانی نہیں — یہ حوروں کا سا حسن ہے اماں میری پیاری! سلیمہ بیگم لنگڑاتی ہوئی پیچھے پیچھے ہدایتیں دیتی چلی آ رہی تھیں — "بس بس ... یہیں — یہیں برآمدے میں فرش پر رکھ دو — گہوارہ — ارے — ارے — آہستہ .... بھئی تم لوگ ارے مُردے کا احترام —"

سہیل میاں بیوی کے کمرے کے دروازے پڑے سب دیکھ رہے تھے سن رہے تھے ... صرف بصارت اور سماعت کام کر رہی تھی — گہوارہ لاکر وسیع برآمدے کے وسط میں رکھ دیا گیا تھا جہاں فرش بچھا دیا گیا تھا۔ چوکا

اٹھ چکا تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھ کر گہوارے کے پاس جا کر کھڑے ہونا چاہتے تھے مگر قدم زمین نے پکڑ لیے تھے۔

"مہرو — مہرو — یہ سفید کپڑے — یہ سفید اوڑھنی — مگر تمہیں تو سفید کپڑے بہت ناپسند تھے — کئی بار میں نے تمہیں سفید ساڑھی لا کر دی مگر تم نے نہیں پہنی — میرے دشمن — میں کیوں پہنوں یہ سفید ساڑھی۔ میں نے کہا۔ بڑی اچھی لگو گی۔ پہن کر تو دیکھو — تم بگڑ اٹھی تھیں۔ نوج — سہاگن کیوں سفید کپڑے پہنے۔ یہ آج کل کے فیشن مجھے کانی آنکھ نہیں بھاتے — کس قدر تھا اسے اپنے سہاگ پر ناز — یقین تھا کہ وہ سہاگن مرے گی — سیاں اپنے کندھے پر اٹھا کر لے جائیں گے — رخصتی کے وقت بھی تو انھوں نے میری پالکی کا ڈنڈا اپنے کاندھے پر اٹھایا تھا — وہ ہنس کر کہتی اور وہ جل کر رہ جاتا۔

"محترمہ واضح رہے آپ مجھ سے دس بارہ برس چھوٹی ہیں، یہ خوش نصیب آپ ہوں گی جو میرا سوگ منائیں گی" —

"اللہ نہ کرے —"

سفید ریشمی کپڑوں میں کیسی اچھی لگو گی — ہمیں تو دیکھنا ہی نہ نصیب ہوا کبھی۔ بوڑھی حور معلوم ہو گی بالکل —"

"اونہہ، مجھے یہ بد شگونیاں زہر لگتی ہیں۔ میرے کفن پر تو سرخ دوشالہ پڑے گا —"

"مہرو آج تم نے یہ سفید کپڑے کیوں پہن لیے — کیسے پہن لیے۔ تمھیں وہم نہیں آرہا — تم نے منع کیوں نہیں کیا ان سب کو — نہیں اب یہ سب کچھ نہیں — اب مہرو جسدِ بے جان ہے — مٹی کا ڈھیر ہے۔ بے خبر — بے پروا — بے نیاز — ہر چیز سے بے نیاز — کوئی آ کر ان سے یوں لپٹ گیا کہ وہ لڑکھڑا گئے — "ابا میاں — ابا میاں — ہائے میری

اماں ـــــ میری اماں "

یہ کون ہے؟ خورشید؟ اچھا تو ماں کے مرنے کے بعد انھیں اجازت مل گئی؟ زندگی میں وہ دیکھنے کو تڑپتی رہی، ترستی رہی، پوچھتی رہی ـــــ "میری اماں ـــــ" وہ بت کی طرح ساکت کھڑے تھے ـــــ چہرہ سفید ـــــ ساری جان پتے کی طرح کانپ رہی تھی!

اختر علی نے لپک کر سنبھالا اور فرش پر بٹھا دیا۔

(۱۴)

موت کا سناٹا گھر پہ مسلط تھا۔ رونے والے شل ہو چکے تھے۔ کام کرنے والے تھک گئے تھے ـــــ دالان کے بیچوں بیچ مہ رخ کا گہوارہ رکھا تھا ـــــ چاروں طرف ماتم دار سر جھکائے بیٹھے تھے ـــــ مرد بھی تھے عورتیں بھی تھیں۔ سلیمہ بیگم، ثریا، سروج، اس کی ماں، نازش، اختر علی شہر سے آئے کچھ دور کے عزیز، عالیہ اور خورشید کے شوہر اور بچے ـــــ رحیمن اب بھی بیوی کی پائنتی بیٹھی تھی اور ایک سیپارہ لیے ہر سطر پہ انگلی پھیر کر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ رہی تھی ـــــ نظیرا دور کھڑا اب بھی رو رہا تھا ـــــ اور کالی چرن قبرستان گیا ہوا تھا۔ گاؤں کے چند بڑے بوڑھے ان کی آخری آرام گاہ تیار کرانے گئے ہوئے تھے ـــــ

پہلو میں ایک طرف سہیل میاں سر جھکائے بیٹھے تھے ـــــ کسی نے بڑا گاؤ تکیہ کمرے سے لا کر ان کے پیچھے رکھ دیا تھا۔ گذشتہ دو گھنٹے سے وہ یوں ہی فرش پر بیٹھے تھے۔ صدمے کی شدت، بڑھاپے کی عمر، ہفتے بھر کی لگاتار اور اب چھتیس گھنٹے کا کرب، بڑھتی ہوئی کمزوری۔ بھوک پیاس کا احساس

مٹ چکا تھا ـــ سردی گرمی سے بے نیاز ہو چلے تھے ۔ کسی نے ان کے اشارے پر مہ رخ کا چہرہ کھول دیا تھا جس پر موت کی زردی اپنا تسلط جما چکی تھی ـــ مگر ان کو یہ چہرہ اب بھی محبوب تھا ـــ ان کی دھندلی میلی سوجی آنکھیں ٹوٹے شیشوں میں سے ان کو دیکھے جا رہی تھیں ـــ اسی بے جان چہرے کے گرد انھیں پچاس سال کی محبت اور خلوص کی شمعیں روشن نظر آ آ رہی تھیں ۔ نورانی شعاعیں سفید اوڑھنی اور سفید بالوں میں سے جیسے پھوٹ رہی تھیں ـــ

" مہرو تمھاری روح شاید اب بھی اپنی اولاد کی منتظر ہے ـــ اولاد ـــ اولاد ـــ جس کو نو مہینے پیٹ میں رکھا ـــ کرب کے ساتھ جنا ـــ جس کو خونِ جگر پلا پلا کر پالا ـــ پوروں سے ناپ ناپ کر اللہ آمین کر کے جوان کیا ۔ جس کی نیند سوئی ، جس کے ساتھ جاگی ، جس کے ساتھ ہنسی جس کے دکھ میں روئی خوشی میں خوش ہوئی ۔ خواہشیں پوری کر کے سب سے بری بنی اور اپنی تمناؤں اور خواہشوں کو جن پر قربان کر ڈالا ـــ اولاد ـــ بڑھاپے کا سہارا ـــ بیماری میں خدمت گزار ـــ دکھ بٹانے والی ـــ غم میں ڈھارس دینے والی اولاد ـــ جس پہ ناز تھا مہرو تمھیں ـــ کہاں ہے وہ تمھاری اولاد تم نے اپنے بڑھاپے کا خیال نہ کیا ـــ سب ان کی خوشی پر نچھاور کر دیا ـــ ان کی بے رخی پر آنسوؤں کے دریا بہائے مگر مجھ سے بھی چھپ کر ـــ ان کی بے محبتی پر دل خون کیا مگر الزام نہ دیا ـــ تم شاہین ـــ جن کے خط نہ آنے پر تڑپیں مگر الجھی نہیں ـــ ان سے مطالبہ نہیں کیا ۔ چھ مہینے فالج کے حملے کے بعد محتاج اور اپاہج زندگی گزاری ، غیروں کے رحم و کرم پر زندہ رہیں مگر اپنوں سے رحم کی ، پیسے کی ، خدمت کی بھیک نہ مانگی ـــ بھتیجی اور بڑی بیٹی ـــ آج بڑی ماتم دار بنی بیٹھی ہیں ـــ اس وقت کسی نے آکر خدمت نہ کی ـــ میں کچھ کہتا تو آنسو پی کر جواب دیتیں ۔ محبت مانگے سے

تھوڑا ہی ملتی ہے ـــــ یہ خلوص، خدمت، محبت سب نصیب والوں
کو حاصل ہوتی ہے ـــــ اور ہمارے نصیب میں قدرت نے اتنی خوشیاں
دے دی تھیں ـ کہ سنبھالے نہ سنبھلتی تھیں ـــــ تو اب یہ دکھ بھی اس نے
دیے ہیں ـــــ ان کو بھی جھیل لیں گے ـــــ" یہ سب باتیں کہتی تھی
مگر دل پر کیا گزرتی تھی یہ تو بس خدا ہی جانتا تھا ـــــ شاید اتنا رنج اتنا
غصہ تھا کہ وہ نام لینے سے گھبراتی تھی کہ دل کا حال کھل نہ جائے ـــــ چھ
مہینے بیمار رہ کر میری دعاؤں اور ڈاکٹر کی کوششوں سے وہ بظاہر تندرست
ہو گئی ـ لنگڑا کر چلتی مگر میرا سب کام خود کرتی ـ بچاری رحیمن نے چھ مہینے
خدمت کی تھی ـــــ مگر اب پھر اسے چھٹی دینی پڑی ـــــ بچاس روپے مہینے
اور ساٹھ ستر روپے کا کھانے دانے کا خرچ کہاں سے اٹھایا جاتا ـــــ جس
کی اولاد ہزاروں میں کھیل رہی تھی ـــــ وہ اب اس قابل نہ تھی کہ ایک ملازمہ
ہی رکھ سکے ـــــ کہنے کو یہی کہتی ـــــ میں خود کروں گی اپنے میاں کا کام ـــــ
چھ مہینے کا وہ کرب اور بے بسی میں کھولنے لگا ـــــ سوچا خدا نے سن لی
اب مہر وا اچھی ہو گئی ـــــ اب پھر وہ دونوں سکون کی زندگی گزار سکیں گے
ـــــ چاہے کتنے ہی بیمار ہوں مگر سکون اور راحت، جب تک بیوی کے
دم میں دم ہے ملتا رہے گا ـــــ بعض وقت میں سوچتا تھا میرے مرنے
کے بعد مہرو کیسے رہے گی ـــــ کون اس کو پوچھے گا ـــــ میں کسی قابل نہیں
ـــــ مگر اسے تو میرا سہارا ہے ـــــ یہ ڈھارس ہے کہ میں اس کے سر پر
موجود ہوں ـــــ کبھی خیال آتا ـ اگر مہرو کو کچھ ہو جاتا تو ـــــ پھر ان
کا بھی اس دنیا میں کون تھا ـــــ"

مگر یہ سب بہلاوے تھے ـــــ جھوٹی تمنائیں ـــــ فریب خوردہ آرزوئیں
ـــــ ایک بادِ تند کا جھونکا آیا ـــــ اور سب کچھ خاک میں مل گیا ـــــ
اب وہ لق و دق صحرا میں ـــــ تپتے ریت پر ـــــ ویران سناٹے میں

۔۔۔ تنہا کھڑے ہیں ۔۔۔ آ نقش زیر پا۔

ہفتہ بھر پہلے اسے دل کا دورہ پڑا ۔۔۔ بلڈپریشر تو تھا ہی دل کو اندر ہی اندر اسے گھن لگ رہا ہی تھا ۔۔۔ نازش شہر سے ڈاکٹر کو لایا ۔۔۔ کہا ہوش آیا تو بچ جائیں گی۔ جھوٹی تسلیاں ۔۔۔

ان کا جسم بھاری ہو گیا تھا اور سہیل میاں کے جوڑ جوڑ پر گھٹیا کا تسلط تھا ۔۔۔ کیسے وہ اس کی تیمارداری کرتے؟ اٹھانا چاہتے تو اٹھا نہ سکتے ۔۔۔ کچھ پلانا چاہتے تو چمچہ ہاتھ میں کانپ جاتا ۔۔۔ بچاری سلیمہ بھابی مدد کر نہیں، نازش نے چھٹی لے لی، اس بچے نے منھ بولی چچی کے لیے ۔۔۔ اور ان کا ہاتھ بٹایا، پھر اگلے دن جاکر رحیمن بوا کو لے آیا ۔۔۔ رحیمن تم کتنے وسیع دل کی ہو ۔۔۔ تم نے ذرا برا نہ مانا ہچر مچر نہ کی بہانا نہ کیا۔ بھر چلی آئیں اور ان کی خدمت میں لگ گئیں ۔۔۔ تم جو بوڑھی ہو، کمزور ہو، بیمار ہو غیر ہو، نوکر ہو، تمھارے دل میں درد تھا ۔۔۔ اور اپنی اولاد کے دل میں نہیں ۔۔۔ عزیزوں کے دل میں نہیں؟ تم جیسے ہم مستقل رکھ نہ سکتے تھے کہ ہمارے پاس اتنا پیسہ نہ تھا ۔۔۔ تم تو بغیر تنخواہ کے کام کرنے پر تیار تھیں ۔۔۔ مگر مہرو کی غیرت یہ گوارہ نہیں کر سکتی تھی!

فالج کا حملہ ہوا تھا تو آٹھ دن کو خورشید اور چار دن کو عالیہ اسپتال تشریف لائی تھیں اور پھر چلی گئی تھیں ۔۔۔ اور بڑے صاحبزادے نے یہ لکھا کہ روپے کی ضرورت ہو تو بھیج دوں ۔۔۔ روپے کی ضرورت ۔۔۔ جیسے درختوں میں روپے پھل رہے تھے ۔۔۔ اس نے کہا تھا ۔۔۔ سیّاں ۔۔۔ تم روپیہ نہ لینا ۔۔۔ مجھے بے دوا کے رہنا منظور ہے مگر ان کا احسان لینا نہیں جو ماں باپ کا حق نہیں سمجھتے ۔۔۔ اور تب انھوں نے چپکے سے گھر گروی رکھ دیا تھا ۔۔۔ علاج دوا میں کسر نہ چھوڑی تھی ۔۔۔ جب تین سال پہلے وہ بیمار ہوئے تھے تو مہرو نے بھی تو دوا علاج میں

جان لٹا دی تھی۔ گلے کی وہ آٹھ تولے کی زنجیر جو انھوں نے اپنی پہلی تنخواہ پر اسے بنوا کر دی تھی ــــ جب سونا پچیس روپے تولہ تھا ــــ کتنا خوش ہوئی تھی وہ ــــ ہر وقت گلے میں وہ پڑی رہا کرتی تھی ــــ اور ان کی بیماری میں دو سو روپے کی یہ زنجیر جو اب ساڑھے پانچ ہزار کی بکی تھی، اس نے چپ چپاتے بیچ ڈالی ــــ وہ زنجیر جو بہوؤں کو نہیں دی۔ بیٹیوں کو نہیں دی ــــ اور اس وقت تیوری پر بل لائے بغیر فروخت کر دی۔ لوگ کہتے ہیں عورت کو زیور پیارا ہوتا ہے۔ جھوٹ کہتے ہیں۔ تہمت ہے عورت پر۔ وہ صرف زیور کو اس لیے محفوظ رکھتی ہے کہ وقت پر وہی ایک چیز اس کے کام آ سکتی ہے! کتنی خدمت کی تھی اس وقت مہرو نے میری خورشید کہتی ہے وہ اپنے میاں سے مجبور ہے ــــ ہو گی ــــ مگر مہرو تو کبھی مجبور نہیں ہوئی، ماں کی، بھائی کی، بھاوج کی سب کی خدمت کی میں منع کرتا تو بگڑ جاتی ــــ تم اپنی جگہ وہ اپنی جگہ ــــ بزرگوں کی خدمت سے عاقبت سنورتی ہے اور پھر مجھے بھی تو چین نہیں آتا ــــ

ایک ہماری اولاد ہے۔ میری بیماری میں امریکن صاحب زادی تشریف لائیں تو ہوٹل میں قیام فرمایا ــــ کھڑے کھڑے دیکھنے آتیں ــــ چند دن میں اتنا بھی کوئی بدل جاتا ہے؟ دولت کیا ضمیر، محبت سب کو سلا دیتی ہے ــــ خدمت تو وہ کیا کرتی۔ وہ تو یوں آتی جیسے کوئی مہارانی کسی ملازم کو دیکھنے چلی آئیں۔ جس کی ماں مہینوں سوئی تک نہیں ــــ آنا جانا ملنا جلنا نہانا دھونا، کھانا پینا کسی کا ہوش نہ تھا۔ اور میری بیٹی، میرا خون ــــ میری لاڈلی ــــ جس کو سب سے زیادہ چاہتا تھا، جس سے ساری ٹوٹی امیدیں وابستہ کی تھیں ــــ وہ دولت کے لالچ میں، بے سہارا ماں باپ کو چھوڑ کر امریکہ چلی گئی ــــ اجازت ــــ واہ ــــ اپنی عزت بچانے کے لیے ــــ اپنے جذبات اور احساسات کو سولی پہ چڑھا کر

ہاں کہہ دینا اجازت ہے؟ نازش میں کیا برائی تھی، سوا اس کے کہ وہ لکھی پڑھی نہیں تھا ــــ بزرگوں کی عزت، خدمت، احترام کرتا ہے ــــ ورنہ اس کا میاں نازش کے پیر کی جوتی کے برابر بھی نہیں ہو سکتا ــــ

جاتے وقت ماں کو روپے دے رہی تھی ــــ میں لرز رہا تھا کہ میری محبت مہرو کو کمزور نہ کر دے ــــ مگر جب اس نے ان ڈالروں کو اٹھا کر پھینک دیا تو میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا ــــ صاحب زادی بگڑ گئیں۔ خفا ہو کر چلی گئیں اور وہ میری خدمت میں لگی رہی۔ کیسا خوف ناک پھوڑا تھا پیٹھ پر ــــ مگر ذرا جو مہرو گھنیاتی ہو ــــ تیمارداری اس سلیقے سے کی کہ ٹرینڈ نرس بھی کیا اس سے اچھی کر سکے گی ــــ صفائی کا اتنا خیال رکھتی ــــ میری بدمزاجی اور چڑچڑا پن، چپ چاپ سہہ لیتی ــــ میں دیکھتا آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں مگر ان کو پی لیتی تھی ــــ مہرو ــــ جو ذرا سی بات پر بگڑتی تھی، لڑتی تھی میری بیماری میں کتنا صبر، کتنا ضبط و برداشت پیدا ہو جاتا تھا اس میں۔

اس کی جگہ میری بیوی کوئی اور ــــ نسیم ــــ یا کوئی بھی ہوتی اور تو کیا ــــ کیا وہ بھی اسی طرح .....

اب آخری وقت بھی کسی نے اس کی خدمت نہیں کی؟ بیٹی، بھتیجی، بہو، بیٹا ــــ سب کو نازش نے تار دیے تھے، کوئی بھی تو نہیں آیا ــــ اور وہ اس کو دھوکہ دیتا رہا ــــ اب آتے ہوں گے ــــ اب آتے ہوں گے ..... وہ صورت دیکھنے کو ترستی ختم ہو گئیں! مگر جاتے جاتے اولاد کو معاف کر گئیں ــــ مگر ــــ مگر میں کسی کو معاف نہیں کروں گا ــــ بس اب کوئی نہیں آئے گا ــــ آنا ہوتا تو چھتیس گھنٹے میں آج کل ہزاروں میل سے لوگ آ جاتے ہیں ــــ بس اب رخصت کر دیتا ہوں ــــ

"نازش....."

"جی چچا جان ——"

"بس اب اور انتظار کی ضرورت نہیں — رخصت کر دو انھیں"

"چچا جان ——"

"نہیں بیٹا ——"

"سہیل بھیا — بس چند گھنٹے اور عشا کی اذان و نماز کے بعد — میں اور زیادہ انتظار کرنے کو نہیں کہوں گا —"

"اف — ظالم ——"

کسے کہا انھوں نے ظالم —— یہ کوئی بھی نہ سمجھ سکا —— اور انھوں نے کمبل سے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔

(۱۵)

جاڑے کی رات کا اندھیرا ——— باغ، صحن اور گھر پہ چھا چکا تھا۔ بجلی کی روشنی اور شمعوں کی جھلملاہٹ بھی اس گھور اندھیرے کو دور نہیں کر پا رہی تھی ——— لوگ خاموش تھے ——— کوئی اونگھ رہا تھا، کوئی سر جھکائے تھا ——— بچے سو گئے تھے، خورشید اور عالیہ سرہانے اور پائینتی بیٹھی تھیں اور رحیمن روتے روتے اور پڑھتے پڑھتے شل ہو چکی تھی۔ ثریا نے زبردستی اسے ایک کونے میں لٹا دیا تھا۔

سہیل میاں نے اچانک کمبل منہ سے ہٹایا۔ چاروں طرف نظر ڈالی۔ پھر خورشید کے چہرے پر نگاہیں رک گئیں!

"کسی کو خیال نہیں آیا ——— وہ ہر موقع پر مجلس ضرور کیا کرتی تھی۔ خورشید کو پڑھنا اسی نے تو سکھایا تھا جب سے آواز کانپنے لگی تھی، خورشید ہی سے پڑھوایا کرتی تھی! وہ نہیں تو کسی کو خیال نہیں ——— "

"خور ——— شید ——— "

باپ کے منہ سے پہلی بار اپنا نام سن کر خورشید تڑپ گئی اور

بے قرار ہو کر ان کے پاس آئی "جی ___ ابا ___ میاں"

"انھیں تمھارا پڑھنا ___ بہت ___ پسند ہے نا ___ کچھ پڑھو

___ مرثیہ پڑھو ___ وہ خوش ہوں گی ___"

آگ کا ایک گولہ سا آکر حلق میں پھنس گیا۔ مگر ابا میاں کی خواہش۔

اماں کی پسند ___ ہائے کتنے برسوں سے وہ اماں کی اتنی سی آرزو پوری

نہ کر پائی تھی کہ محرم میں ان کے پاس آکر رہتی اور مجلس پڑھا کرتی۔

سلیمہ بیگم نے ثریا کو اشارہ کیا وہ اپنے گھر کتابیں لینے چلی گئی۔

سہیل میاں کو پہلا محرم یاد آگیا ___ شادی کو چند ہی دن ہوئے

تھے ___ ان کی مرضی نہ تھی کہ مہر و میکے جائے مگر اماں کا حکم ___ ساس

کی خواہش ___ رواج ___ وہ مجبور ہو گئے ___ ۲۸ بقر عید کو مہرو ان سے

رخصت ہو کر میکے چلی گئی تھی ___

محرم تو اماں جی بھی کرتی تھیں۔ بڑی عقیدت، محبت اور دھوم

سے کئی دن پہلے سے اس دالان میں سفیدی ہوتی۔ پٹکوں کو دھوپ دی

جاتی۔ علم کے پنجے گلاب سے دھوئے صاف کیے جاتے۔ شہ نشین کے آگے

بچھانے کا تخت اور علموں کی چھڑیاں اور ہر ہر چیز دھوئی اور پاک کی جاتی

ماں جی کے سوا بس بڑی بھابی ان کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ اور کسی کو چھونے کا

حکم نہ تھا ___ پھر ۲۹ سے شہ نشین میں علم نصب کیے جاتے۔ ضریح (امام

حسین کے روضے کی شبیہہ) بیچ میں ہوتی۔ ریشمی اور کامدار پٹکوں والے

علم دونوں طرف بڑی نفاست سے لگائے جاتے۔ چھوٹے علم سب منت

کے تھے۔ بڑے بھیا کی منت کا علم، چھوٹے بھائی جان کی منت کا علم اور

ان کی منت کے۔ لے تو جانے کتنے علم تھے اور تو اور ابا میاں کی منت اور بڑے

ابا کی منت کا علم بھی نصب تھا اور جو زندہ تھے وہ سب ۸ محرم الحرام کو

حضرت عباس کے بڑے علم کے نیچے سقہ بنائے جاتے۔ پیٹھ پر شربت

سے بھری مشک، ہاتھ میں ہرے ٹیکے کا علم، چہرے اور سر پہ لال رنگ کی اندھیری اور بدن میں ہرے رنگ کا کرتا ــــ اور وہ موٹے، چھوٹے موٹے کی نذر کا شربت سب کو پلانے پھرتے تھے۔ ساتویں محرم کو مہندیاں چڑھتیں ــــ سنّی عورتیں، ہندو عورتیں، منّت کی مہندیاں چڑھاتی تھیں۔ بعض اپنے بچوں کو حضرت عباس کا بہشتی بناتی تھیں ــــ منّت ماننے والے مہندی کے کنول اچک لیتے اور ان کو ہاتھ میں لے کر منّت مانتے۔ مہندیوں کے ساتھ حضرت قاسم کی شادی کی یادگار کا ملیدہ بھی بنتا اور وہ سب ماتم داروں اور دوسرے لوگوں میں تقسیم ہوتا۔ نذریں پہنائی جاتیں۔ اور دوپہر کو دھوم دھامی زنانی مجلسیں ہوتی تھیں۔ ماں جی کو کتنا ارمان تھا کہ ان کی بہو آئے اور ان کی زندگی میں محرم کو سنبھال لے ــــ اس کا دل چاہتا تھا مہرو ابھی سے گھر کا محرم کرے، مگر ماں جی نے اسے سمجھایا تھا۔ نہیں میرے لعل، پہلا محرم دلھن اپنے میکے میں کرتی ہے اور پہلی عید سسرال میں!

اگرچہ محرم کی وجہ سے گھر میں بہت چہل پہل تھی۔ بڑی بھابی اور بڑے بھیا، چھوٹی بھابی، چھوٹے بھیا اور ان کے بچے اور تو اور باجانی تک اس سال محرم کرنے آئے ہوئے تھے ــــ مگر اسے ہر طرف سنسان سا لگتا تھا ــــ بڑی بھابی چھیڑتیں۔ چھوٹی بھابی طنز کرتیں اور وہ کھسیا کر رہ جاتا پھر سات محرم کو ممانی نے منّت پہنانے کے لیے اس کو اپنے ہاں بلوایا تھا۔

وہ سسرال پہنچا تو سامنے ہی مجلس کے دالان میں مہرو کھڑی نظر آئی سبز ریشمی غرارہ، سفید چکن کا کرتا اور سبز ہی رنگ کا دوپٹہ جو اس کے چہرے کے گرد ہالہ کیے ہوئے تھا۔ پہلے محرم میں نئی بیاہی لڑکی کالے کپڑے نہیں پہنتی ــــ اس کی گوری گوری گداز باہیں چوڑیوں سے خالی تھیں ــــ کان گلے میں کوئی زیور نہ تھا ہاں ہاتھ میں چاندی کی ایک منّت کی چوڑی ضرور پڑی تھی ــــ سادگی کی یہ مورتی انھیں زیور اور گوٹے ٹھپے میں لدی مہرو سے کہیں

زیادہ اچھی لگی تھی۔ سسرال کا گھر چھوٹا تھا ـــــ شہ نشین میں علم چھوٹے تھے اور کم بھی۔ دری اور چاندنی پر قالین نہیں تھے۔ مگر ماتم اور سوگ کی فضا جیسے سارے ماحول پر چھائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ مہرو اسے دیکھ کر مسکرائی اور پھر سہم کر منھ پر ہاتھ رکھ لیا۔ امام کے چالیسویں تک وہ مکمل سوگ کیا کرتی تھی ـــــ اگر وہ کبھی اسے چھیڑنے کو کہتے ـــــ اب وہم نہیں آتا ـــــ چوڑیاں اب کیوں اتاریں تو وہ غصّے سے انھیں گھورتی ـــ "بس چپ رہو۔ ـــــ مولا پہ تو میں اور تم کیا ـــــ ہر چیز صدقے کر سکتی ہوں ـــــ ارے ہماری بیویاں اور شہزادیاں سوگ میں ہیں ـــ اور ہم سوگ نہ منائیں" خالہ اماں نے انھیں منت کا پینکڑا پہنایا تھا۔ جب تک زندہ رہیں ہر سال نند دے کر پینکڑے (پیر کے کڑے) میں سوا پانچ آنے کی چاندی کا اضافہ کر دیتی تھیں اور ان کو پہناتی تھیں ـــــ ان کے بعد ـــ آج تک ـــ مہرو ان کی منت پوری کرتی رہی تھی اور ماں جی جوا ٹھ کر سفہ بناتی تھیں ـــــ وہ منت بھی وہ ہمیشہ پوری کرتی رہی ـــــ انھیں ان منتوں پر عقیدہ نہیں ـــ مگر ماں خالہ ـــــ بیوی کی گہری عقیدت مجبور کر دیتی کہ ان کے جذباتِ عقیدت کو ٹھیس نہ پہنچائے ـــ

اس رات انھوں نے پہلی مرتبہ مجلس میں مہرو کا پڑھنا سنا تھا ـــــ وہ جنابِ عباس کا مرثیہ لحن سے پڑھ رہی تھی اور دو تین رشتے کی بہنیں ساتھ دے رہی تھیں!

دنیا میں چھوٹے بھائی سے ~~بہتر~~ بہن پیارا کوئی ـــ دل کا سرور آنکھوں کا تارا نہیں کوئی
گر ہے تو یہ ہے اور سہارا نہیں کوئی ـــ کہنے کو یوں ہیں سب پہ ہمارا نہیں کوئی
پوچھو اسی سے بھائی سے جس کی جدائی ہو!
گر باپ ہو جہاں میں پیدا تو بھائی ہو!

وہ دل ہے داغدار جو ہجراں نصیب ہے کوئی بعید یار سے کوئی قریب ہے
اس باغ کا بھی رنگ عجیب و غریب ہے اگر چمن میں پھول نہیں عندلیب ہے

"آہ مہرو — مہرو — مہرو — اگر چمن میں پھول نہیں عندلیب ہے"

وہ پھر کھو گئے — محسوس ہوا وہ باہر کی بیٹھک میں بیٹھے ہیں اندر مہرو کی پاٹ دار آواز جس میں درد بھی تھا اور سوز بھی ان کے کانوں میں آرہی ہے!

اچانک خورشید کی آواز بلند ہوئی۔ آنسوؤں میں ڈوبی درد و غم میں چور — آواز — انھوں نے آنکھیں کھولیں — بیچ میں گہوارے میں مہرو لیٹی ہے! سرہانے کی طرف خورشید، عالیہ اور ثریا تکیہ سامنے رکھے پڑھ رہی ہیں آواز جو پہلے بہت دھیمی تھی — رفتہ رفتہ بہت بلند ہو رہی تھی — درد کا ایک ساگر تھا جو لہریں مار رہا تھا — الفاظ تھے کہ شجر و حجر در و دیوار کو لرزا رہے تھے — عقیدت کے — محبت کے — غم کے آنسو ہر آنکھ سے بہہ رہے تھے — اور خورشید ایک جذب کے عالم میں پڑھے جا رہی تھی — وہی ماں کی سی سوز و ساز میں ڈوبی پاٹ دار آواز سے

عالم میں جو تھے فیض کے دریا وہ کہاں ہیں

جو نورِ خدا سے ہوئے پیدا وہ کہاں ہیں

پیدا ہوئی جن کے لیے دنیا وہ کہاں ہیں

ہم سب سے جو تھے افضل و اعلیٰ وہ کہاں ہیں

جو زندہ ہے وہ موت کی تکلیف سہے گا

جب احمدِ مرسل نہ رہے کون رہے گا

اور پھر بہتے آنسوؤں کو پونچھا — ایک چھوٹی سی کتاب کی ورق گردانی کی اور سلام شروع کر دیا!

زرد ہے چہرہ نحیف و زار ہوں ۔۔۔ ماتم سجاد میں بیمار ہوں
مثل بوئے گل سفر ہوگا میرا ۔۔۔ وہ نہیں ہیں جو کسی پر بار ہوں
عالم پیری میں آئے کون پاس ۔۔۔ اے عصا گرتی ہوئی دیوار ہوں

ایک ایک لفظ ان کے کلیجے کے پار ہوئے جا رہا تھا ــــ اور خورشید پڑھے جا رہی تھی ؎

شہ کو عرضی میں یہ صغرا نے لکھا ۔۔۔ رحم کیجیے طالب دیدار ہوں

ذرا دیر اس کی ہچکی سی بندھ گئی پھر ضبط کر کے اس نے دہرایا ؎

مثل بوئے گل سفر ہوگا مرا ۔۔۔ وہ نہیں ہیں جو کسی پر بار ہوں!

آواز ٹوٹ گئی، ہچکی بندھ گئی ــــ عالیہ نے گلے میں باہیں ڈال دیں، ثریا نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا ــــ وہ بے ہوش تھی یا نیم بے ہوش؟

"ہاں ــــ اب روؤ ــــ جتنا رویا جا سکے ــــ" ان کے لب ہلے مگر بے آواز۔

اختر طلی نے پاس رکھی انیس کے مرثیہ کی جلد اٹھالی۔ وہ بہت اچھا تحت اللفظ مرثیہ پڑھتے تھے ــــ مہرو بھابی کو ان کا یہ پڑھنا بہت پسند تھا ــــ محرم میں ایک مجلس، پردہ کے پیچھے بٹھا کر ان سے ضرور پڑھوایا کرتی تھیں ــــ انھوں نے اپنے دوست کو دیکھا ــــ ایک لمحہ کو خیال آیا ــــ ان کا حال اور تباہ ہو جائے گا ــــ پھر سوچا ــــ نہیں ــــ غم حسینؑ میں اپنے غم کو ڈبو دینے سے سکون ملتا ہے! ذرا سا کھنکھارے حلق خشک تھا ــــ آواز بوڑھی ہو چکی تھی مگر اب بھی کڑک دار تھی۔ یہ رباعی دھیمے لہجے میں پڑھی۔

گر لاکھ برس جیے تو پھر مرنا ہے ۔۔۔ پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیا کر لے ۔۔۔ غافل تجھے دنیا سے سفر کرنا ہے!

سہیل میاں ٹکٹکی لگائے مہرو کی صورت دیکھ رہے تھے۔ انھوں

نے وہ مرثیہ شروع کیا جو بھابی اور سہیل دونوں کو بہت پسند تھا۔ آواز میں ذرا سی لرزش تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے دھندلی ہو رہی تھیں ؎

جب خاتمہ بخیر ہوا فوج شاہ کا | کوثر پہ قافلہ گیا پیاسی سپاہ کا
گھر لٹ گیا جناب رسالت پناہ کا | خاک اڑ رہی تھی حال یہ تھا بارگاہ کا

بھائی، نہ وہ رفیق، نہ وہ نور عین تھے
وہ بہنیں رونے والیاں تھیں، ایک حسینؑ تھے

گریہ کا دبا دبا شور ہو رہا تھا۔ رحیمن بوا کی آواز بلند تھی اور ہائے میرے مولا کا نعرہ لگائے جا رہی تھیں۔ اختر علی پڑھے جا رہے تھے۔ ان کی آواز و لہجہ اب بلند ہو چکا تھا۔ وہ گرد و پیش سے بے خبر ہو کر انیس کے مرثیہ کے حسن اور اپنے فن کے مظاہرے میں کھوئے ہوئے تھے ؎

وہ گھر کہ جس میں لاتے تھے جبریل وحی رب
واں تیر فوجِ ظلم سے آتے تھے ہے غضب
نہوڑائے سر کھڑے تھے شہنشاہ تشنہ لب
تر تھا جواں پسر کے لہو سے لباس سب
لب پیاس سے کبود تھے رخسار زرد تھے
مولا کی ایک جان تھی اور لاکھ درد تھے

بھوکے، پیاسے، زرد رو، غم سے چور، شکستہ کمر سہیل میاں اپنا غم اپنا دکھ بھول گئے — نواسہ رسول کی حالت — ہر دل سے ایک آہ کے ساتھ نکلا۔ مولا کی ایک جان تھی اور لاکھ درد تھے اختر علی کا جوش اور آواز کا تاثر اور اتار چڑھاؤ۔ ایک سماں بندھا ہوا تھا ؎

فرماتے تھے کہ واہ یہ تاخیر اے اجل | اکبر کے بعد کون سا تھا زیست کا محل
اب مجھ کو اک برس کے برابر ہے ایک پل | موت آئے اب یہ ہے شجرِ زندگی کا پھل

ایک جا چھری گلوں پہ جو چلتی تو خوب تھا
یہ جان، ان کے ساتھ، نکلتی تو خوب تھا

اٹھتا نہیں حسینؑ سے اب بارِ زندگی | اے موت اب گرا کہیں دیوارِ زندگی
جیتے رہیں وہ جو ہیں طلبگارِ زندگی | اب دق ہے اپنی جان سے بیمارِ زندگی

جنت میں پیاس تشنہ دہانوں کو لے گئی
افسوس، خوب چن کے، جوانوں کو لے گئی

اختر علی پڑھے جا رہے تھے — امام حسین کی بے کسی اور بے بسی اہل حرم سے رخصت، بہنوں کی بے قراری، بچوں کی تڑپ۔ درد و غم کا ایک مرقع تھا جو آنکھوں کے سامنے محسوس ہو رہا تھا — اور ہر دل میں یہ احساس کہ ہماری مصیبت، ہمارا غم، ہمارا دکھ بے حقیقت ہے اس صابر و شاکر مظلوم امام کے دکھوں کے سامنے جس نے ایک دن میں بہتّر دوستوں اور عزیزوں کی جدائی کے داغ سہے، زخم پر زخم کھائے مگر صبرِ جمیل کے معنی دنیا کو دکھا دیے —

اور سہیل میاں اب کچھ نہیں سن رہے تھے — کان میں کوئی آواز نہیں آ رہی تھی — آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں ضرور جاری تھیں اور منھ میں بڑبڑا رہے تھے —

اب دق ہے اپنی جان سے بیمار زندگی — اب دِق ہے — اپنی جان سے بیمار زندگی . . .

اچانک اختر علی نے مرثیہ بند کر دیا۔ اور نازش کو اشارہ کیا اور پھر سب سہیل میاں کی طرف دوڑ پڑے۔

(۱۶)

اب وہ سنبھل چکے تھے!

موم بتیاں اور اگر و لوبان کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

سورج ڈوب چکا تھا۔ کچھ لوگ اونگھ رہے تھے۔ کچھ کے چہروں پر بے پناہ تکان تھی ــــ کچھ بیزار سے بیٹھے تھے سوچ رہے تھے آخر یہ انتظار کب تک؟

"اختر ـــــ"

"ہاں بھیا ـــــ"

"سہیل . . ."

"جی چچا جان ـــــ"

"بس اب بسم اللہ کرو ـ سب کو تکلیف ہو رہی ہے"

"چچا جان ـــــ تھوڑی دیر اور ـــــ"

"نہیں ـــــ" ان کے لہجہ میں تحکم تھا ـــــ "اب انتظار کی ضرورت نہیں اب ہم ان کو ان کی آخری آرام گاہ لیے چلتے ہیں ـــــ دوسری رات بھی گزر رہی ہے ـــــ اب اور انتظار ـــــ اور آخر کس کا انتظار . . ."

خورشید اور عالیہ نے بلکنا شروع کر دیا۔ رحیمن بآوازِ بلند رونے لگیں۔ اونگھتے لوگ چونک پڑے — باہر بیٹھے لوگ اندر آ گئے — خورشید کی لڑکیاں ماں سے لپٹ گئیں۔ اور عالیہ و خورشید کے شوہر اور لڑکے گہوارے کے قریب آ کھڑے ہوئے۔ پردے دار عورتوں نے ذرا سا گھونگھٹ کھینچ لیا۔ عین اس وقت دروازے پر موٹر رکنے کی آواز آئی — ایک ہارن سنائی دیا، نازش باہر دوڑا۔ خورشید اور عالیہ منتظر نظروں سے باہر کی طرف دیکھنے لگیں!

آگے پیچھے دو ٹیکسیاں دروازے کے سامنے کھڑی تھیں! اور دونوں میں سے مسافر اتر رہے تھے!

خورشید نے آنسو پونچھ کر دیکھا — ایک جوان لڑکی، ایک عورت کو سنبھالے اندر آ رہی تھی۔ سیاہ ساڑھی، سیاہ بلاؤس — سیاہ کوٹ، پہنے ہچکیاں لیتی شاہین آگے بڑھی اور خورشید دوڑ کر بہن سے لپٹ گئی!

پیچھے ایک لمبا تڑنگا، پینتالیس سال کا خوب صورت تندرست شخص اعلیٰ درجے کا سوٹ پہنے، بال کچھ الجھے اور بکھرے ہوئے، چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ چلا آ رہا تھا۔ نازش نے اپنا بازو اس کے گرد حائل کر رکھا تھا۔

"بھیا — بھائی جان —" دو تین چیخیں بلند ہوئیں اور خورشید و شاہین اس کی طرف لپکیں... اور پھر ذرا کی ذرا ٹھٹک گئیں۔ یہ ان کا بھائی ہے؟ — خاموش، باوقار، ہر ایک سے بے تعلق سا — مگر پھر جا کر اسے لپٹ گئیں!

سہیل میاں اپنا دُسّہ لپیٹے کھڑے ہوئے۔ دالان میں کئی انگیٹھیاں جل رہی تھیں مگر سردی جگر کو اب بھی کپکپا رہی تھی —

مہرو کا چہرہ کھول دیا گیا تھا اور گہوارے پر سفید چادر کے اوپر سرخ دو شالہ ڈال دیا گیا تھا — ماں جی کا دو شالہ جس پر سنہری کام

تھا اور شادی کے بعد بڑے چاؤ سے انھوں نے اسے مہرو کو اڑھایا تھا۔

اس کا رنگ اب بدرنگ ہو چکا تھا سینے میں بہت سے چھید تھے۔ زری کالی پڑنے لگی تھی ـــــ اس کی چیزیں بھی اب آخری سانسیں لے رہی تھیں۔

سہیل میاں کے دل کا سناٹا ذرا دیر کو گھر بھر پر چھا گیا ـــــ گہوارے کے ایک طرف مہرو کی بیٹیاں، بھتیجی، نواسیاں، پوتی اور اس کی غمگسار چاہنے والی ثریا اور سروج کھڑی تھیں! دوسری طرف ذرا جھکے ہوئے سہیل میاں اور ان کے پیچھے اختر نازش اور داماد اور دوسرے دور پرے کے عزیز کھڑے ہوئے تھے ـــــ سب اشک بار تھے مگر آواز کوئی نہ تھی۔ مہرو کے پہلو میں ایک ہاتھ سے کمر کو سہارا دیے سہیل میاں کھڑے تھے۔ ایک بار اور اپنی پچاس سالہ رفیق کا دیدار کرنے کے لیے ـــــ

اور ان کی پائینتی تنویر ـــــ ان کا لاڈلا چہیتا ـــــ سب سے بڑا بیٹا تصویر بنا کھڑا تھا ـــــ اس کی نظریں ماں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ چہرہ سفید پڑا ہوا تھا ـــــ

اختر علی پریشان کبھی دوست کو دیکھتے، کبھی تنویر اور شاہین پر نظر ڈالتے ـــــ یہ لوگ باپ سے لپٹ کیوں نہیں جاتے کہ ان کے تڑپتے دل کو ذرا سی ڈھارس بندھے؟ مگر ایک ہیبت ناک خاموشی کا تسلّط تھا!

باہر کے لوگ بھی چپ چاپ کھڑے ہوئے تھے۔ بھلا جب گھر کے لوگ اپنی میت پر نہ روئیں تو باہر کے آنے والے رو کر کیوں نکّو بنیں؟

اور پھر اس سناٹے کو چیرتی ہوئی رحیمن بوا کے بین کی آواز سارے گھر کو ہلا گئی!

"اے میری بوی ـــــ اے میری بہو بیگم ـــــ آنکھیں کھولو ـــــ دیکھو تو کون کون آیا ہے ـــــ ارے کب سے تڑپ رہی تھیں ـــــ بلبلا رہی

تھیں کہ ایک نظر بچوں کو دیکھ لوں ــــ اے میری ناشاد بیگم تمھارا بیٹا آیا ہے۔ خورشید دن آئی ہے ــــ ارے شاہین بٹیا بھی تو آ گئیں ــــ تمھارے نواسے پوتے آئے ہیں ــــ میری بیوی ایک نظر تو ڈال لو ــــ اپنے بچوں پر ــــ"

اور اسی آواز کے ساتھ ساتھ تین چار چیخیں بلند ہوئیں۔ خورشید نے پائے پر سر ٹیک دیا ــــ شاہین ماں کے اوپر اوندھ گئی ــــ" اماں ــــ اماں" بس یہی اس کے منھ سے نکل رہا تھا ــــ تنویر گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا اور اپنا سر ماں کی پائنتی' ان کے قدموں پر جھکا دیا ــــ اس کے گلے سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی مگر سارا جسم ہل رہا تھا ــــ

اختر علی نے سہیل میاں کو جھنجھوڑا ــــ

"سہیل ــــ سہیل ــــ سہیل بھیا ــــ"

انھوں نے سر اٹھایا' دوست کو دیکھا اور پھر جھکا لیا ــــ

"سہیل بھیا ــــ اپنے بچوں کو ــــ گلے لگا لو ــــ" اور وہ رو پڑے۔

"ہاں ــــ بچے ــــ میرے بچے ــــ" کیسا طنزیہ لہجہ تھا ــــ ایک انوکھی مسکراہٹ ان کے بے رنگ ہونٹوں پر بکھر گئی ــــ بچے آئے ہیں ــــ مہرو ــــ ہمارے بچے آئے ہیں ــــ تم ماں ہو نا ــــ گلے لگا لو ان سب کو ــــ تم مومن تھیں ــــ سب کچھ بھول گئیں تھیں ــــ معاف کر دیا تھا ــــ دیکھو مہرو ــــ یہ سب آئے ہیں۔ تمھارے قدموں میں جنت ڈھونڈ رہے ہیں ــــ"

سناٹا ختم ہو گیا ــــ فلک شگاف چیخیں فضا میں گونجیں۔ خورشید' عالیہ' شاہین' تنویر سب کے سب آکر باپ

سے لپٹ گئے ـــ بلکتے رہے ـــ تڑپتے رہے!

اور سہیل میاں نے ہاتھ سے سب کو پرے ہٹا کر اپنا چہرہ بیوی کے چہرے پر جھکا دیا!

ختم شد